پطرس کے مضامین

اظہار عقیدت

میں اپنے اُستاد محترم جناب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظرثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا۔ میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی ان سے فیض تلمّذحاصل ہے۔

پطرس

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے، تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں، حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلّم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی "ہرچند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں" آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ اُن کی غلط فہمی اگر دور ہوجائے تو کیا مرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیرملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں، وہ پہلے اُس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کرلیں۔

پطرس

ماسٹل میں پڑنا

م نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کرلیا، لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی۔ ماسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا؟ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔ جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی اسکول کے ہیڈماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بےکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بےشمار آنے والی نسلوں کی بہبود کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لیے وظیفے کا نہ ملنا خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخرومباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتے داروں" نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت ونجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لیے بلاتکلف یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک وقوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہےکہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ کیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیرجانبدار اور ایماندار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کرچکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی، تصنیف وتالیف، دندان سازی، عینک

سازی، ایجنٹوں کا کام غرض یہ کہ بےشمار مفید اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جاسکتے ہیں۔ اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان مرفن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کردیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گردونواح میں کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہوگیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوشگوار مقام ہے۔ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بےحدموزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کردیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی، لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبعیت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے۔ اور فطرت اپنا کام حسن وخوبی کے ساتھ کرسکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کردیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کرکے ہمارے والد پر یہ ثابت کردیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ ومعصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بےشمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہوگیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے۔ اور جو طلباء باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یاتوشراب کے نشے میں چوُر سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانہ میں ہزارہا روپے مار کر خودکشی کرلیتے ہیں یا پھر فرسٹ ائیر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کربیٹھے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائےلیکن ماسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ماسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید۔ مگر ماسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنالیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ماسٹل کی زد سے محفوظ رہے تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ ازحد غوروخوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے۔ اور ان کو ہمارا سرپرست بنادیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیرخوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بےانتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اُٹھ رہا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قو ٰی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا۔ اور تعلیم کا اصلی مقصد فوت ہوجائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روزبروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں، میں بھلا سینما سے کیا اخذ کرسکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندرسبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے، اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دوبار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہوجاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیئے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی، کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سادروازہ رات کے وقت

بامر سے کھولا جاسکتا ہے، کون سا ملازم موافق ہے، کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کرلیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ماسٹل میں رہنے و الے طلباء کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روزبروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں، میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھروالوں کو ماسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ماسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہوجائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم وتشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کرکے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ماسٹل کو واپس آرہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آگئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروادیا۔ توبہ ہے الہ ٰی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہوگئے۔ ماسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہوگئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویئے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیئے تھا۔

ان می ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آکر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو

سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آگئی تھی پچھلے سال ماسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں، وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ماسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ماسٹل سے بامرشخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے۔ اور نفسیات کے نقطہ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی، تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملاہے، جانتا ہے کہ "والدینی اغراض" کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے اپنے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کرسکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کردیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیران بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ماسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار، ان مضمونوں پر وقتاًفوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا:

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض ومعروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا۔ "دیکھئے نا۔ مثلاً ایک طالب علم ہے، وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے دوسرا اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے۔ اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے جس سے آدمی کو پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے، ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت--- نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیئے ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اگر ہو بھی۔ تو بھی--- گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے--- ٹھہرئیے، میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے، اس کے بعدمیں وہاں سے اُٹھ کر چلاآیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہیئے۔ شخصیت ایک بےرنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنالیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے۔ "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟" میں نے کہا "چال چلن کہہ لیجیئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ماسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہوجاتا ہے!"

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا۔ "جی ہاں۔"

"یعنی ماسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز، روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں ، سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں"۔

کہنے لگے۔ "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا، اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن۔" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اگلے سال گرمی کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا، نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ماسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ماسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہوجاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ماسٹل کی آب وہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے

حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلباء سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں، اس سے رسوخ بڑھتا ہے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا، معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہوگئی تھی، ہر گز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہوگیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔اے کا امتحان دیا، تو فیل ہوگیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔اے میں پےدرپے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آگیا تھا، لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے میں وہ پہلی جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوجائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بےقاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔اے میں کیوں فیل ہوا؟ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا، اس لیے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہوگئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے، یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں، نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔)

اب جب ہم بی۔اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے فالتو کام نہ کرنا پڑےگا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیالیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہوگئے۔ چنانچہ بی۔اے میں

ہمارے مضامین انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔
ہماری قوت مطالعہ منتشر ہوگئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتےتو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لیے وقف کردیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کماحقہ توجہ نہ کرسکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہوگیا لیکن بی۔اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہوگیا۔ اب آپ ہی سوچئے ناکہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا بلکہ اس کے بجائے۔۔۔ مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کرچکا ہوں۔
فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لیے ازحد حیرت کا موجب ہوا۔ اور سچ پوچھیئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہوگئے اور اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہوگئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔
اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیئے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو، مطالعہ نہیں کرسکتے۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ بایدوشاید، باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے لیکن ہم نے یہ تو ثابت کردیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہوسکتے ہیں۔
اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کرلیا کہ جہاں تک ہوسکا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بےمعنی قواعد کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بناسکتے تو اپنی طبعیت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا اس نتیجے پر پہنچے کہ تین

مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہوگئے۔ اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔
جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:
(۱) انگریزی --- تاریخ--- فارسی
(۲) انگریزی--- تاریخ
(۳) انگریزی--- فارسی
(۴) تاریخ--- فارسی
گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہوسکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہوگیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کردیا:
(۵) تاریخ میں فیل
(۶) انگریزی میں فیل
اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات دور ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فارسی میں فیل ہوجائیں۔ لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے ہرچند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہوگا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہوجائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی۔اے ہوجائیں گے۔
ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کردیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یکلخت اور فوراً، رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہوسکتے، والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبعیت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام ہمی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہوجائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن

بھی خوا ہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا کیونکہ تجربہ سے ان پر ثابت ہوچکا تھا کہ میرا انداز غلط نہیں ہوتا،لیکن ادھر اُدھر کے لوگ "اجی نہیں صاحب" اجی کیا کہہ رہے ہو"۔ "اجی یہ بھی کوئی بات ہے"۔ ایسے فقروں سے ناک میں دم کردیتے۔ بہرحال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشن گوئی کردی۔ دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیش گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیاکہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہواتو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربا بنانا پڑےگا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا، جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا، ان کے سامنے نہایت بےتکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلباء کے والدین سے بھی اس مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعدادوشمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں، اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غوروخوص میں تبدیل ہوگیا، لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا۔ کہنے لگے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔"

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے، جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی کے گھر میں دستیاب نہیں ہوسکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے پنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جابجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علے الصبح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن

روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں، جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلباء اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلباء رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ۔۔۔" والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں، اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط وکتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہاسٹل میں آرہے ہیں۔ جس سے ہم طلباء کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے، اور فلاں فلاں قواعد سے اپنےآپ کو مستثنٰی سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کرچکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہوگئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کرکے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

* * *

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکرجی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ "لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحرخیز ہیں، ذرا ہمیں بھی صبح جگادیا کیجیئے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اُٹھتے ہی انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکابازی شروع کردی کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر، جاگیں تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤاجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اُٹھی ہوگی۔ بھتیرا آوازیں دیتا ہوں--- "اچھا!--- اچھا!--- تھینک یو!--- جاگ گیا ہوں!--- بہت اچھا! نوازش ہے!" آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے، زندہ ہوگیا تو ہوگیا، نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑجایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو بھلا ہم سے کیسے ہوسکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے، پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخرکار جب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی، تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں، کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا کہ آج پتہ چلائیں گے، یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی

تھیں۔ ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی، تو فکر سی لگ گئی کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو پڑوسی کو آواز دی۔ "لالہ جی!--- لالہ جی؟"
جواب آیا۔ "ہوں۔"
میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"
کہنے لگے "تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟"
تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہوگئے، چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں۔"
کہنے لگے۔ "تین--- تو--- نہیں--- کچھ سات--- ساڑھے سات--- منٹ اوپر تین ہیں۔"
میں نے کہا۔ "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے، میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا، یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اُٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اُٹھ کے ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیرزادے ہیں، کوئی مذاق ہے، لاحول ولاقوۃ"۔
دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد وتشدد کو خیرباد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سوگئے۔
اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اُٹھے، بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔
شام کو واپس ہاسٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبعیت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرےمیں داخل ہوئے کہ
بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی۔ "مسٹر"۔
ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں۔ اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)
میں نے کہا۔ "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے؟" بولے "ذرا--- وہ میں--- میں ڈسٹرب ہوتا ہوں ۔ بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا۔ "اونابکار انسان دیکھ پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں "صاحب، خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت

دے۔"
آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کرکے میز کے سامنے آبیٹھے، دانت بھینچ لئے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھا لیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ سبز، زرد سب ہی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کوئی سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگادیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔
بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کردیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا پھر ۱۵۔اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا، لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے ہی کیوں نہ اُٹھ بیٹھے لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا۔ تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اُٹھنا تو لغویات ہےالبتہ پانچ، چھ، سات بجے کے قریب اُٹھنا معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی، اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرماو ہم ثواب۔
یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اُٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیئے۔ کھانا بامر سے ہی کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہوگئے۔
چلتے چلتے خیال آیا، کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوت ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اُٹھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی کیا حرج ہے؟
ڈرتے ڈرتے آواز دی۔ "لالہ جی!"
انہوں نے پتھر کھینچ مارا "یس!"
ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں، تتلا کے درخواست کی کہ لالہ جی، صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں---"
جواب ندارد۔
میں نے پھر کہا "جب چھ بج چکیں تو--- سنا آپ نے؟"
چپ۔
"لالہ جی!"
کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "سن لیا سن لیا چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فور ایلفا پلس---"
"ہم نے کہا ب--- ب--- ب--- بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔"
توبہ! خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انہوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کردی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کردی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے۔ اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اُٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتہ۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسایا خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ، لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو۔ یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو، کہ محض اس شبہ کی بناء پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سمانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اُٹھتا۔ "لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہوجاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے یعنی اگر صبح کے بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا۔"

لالہ جی نے ہماری اس جادوبیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔ "تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا۔ "ماں ماں، واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بےشک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میزپر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکالیا۔ اوورکوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر لیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیاسلائی کو تکیئے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی، اور دل

میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سوگیا۔
صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی، نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈمارننگ" کیا، اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا، لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔
ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اُٹھے۔ دل سے کہا کہ "دل بھیا، صبح اُٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے"۔ دل نے کہا "اور کیا؟ تمہارے تو یوں ہی اوسان خطا ہوجایا کرتے ہیں"۔ ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار، یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا ومافیہا سے بےخبر نیند کے مزے اُڑاتے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ "بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔" ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یو ں ہی سا لحاف اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے---
"خوب۔ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں بس ذرا اس کی عاد ت ہوجائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کردیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے ہم بھی کیا روزبروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں نہ خدا کا ڈر اور نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کرلیں گے۔ اکبر بیچارا یہی کہتا کہتا مرگیا لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی--- (لحاف کانوں پر سرک آیا)--- تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں--- بہت ہی پہلے--- یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے۔ کیا بات ہے! خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اُٹھنا چاہئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے--- (لحاف سر پر)--- بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روزبروز بڑھتی جاتی ہے--- (آنکھیں بند)--- تو اب چھ بجے ہیں تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتابیں پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہوسکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون واطمینان میسر ہوگا اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دلآویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے--- لیکن ٹھیک ہی رہے گا شیکسپیئر--- نہیں ورڈزورتھ--- لیڈی میکبتھ---

دیوانگی--- سبزہ زار--- سنجر سنجر--- بادبماری--- صید ہوس---
کشمیر--- میں آفت کا پرکالہ ہوں---
یہ معمہ اب مابعد الطبعیات می سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے۔
اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے!
کالج مال میں لالہ جی ملے۔ "مسٹر! صبح میں نے آپ کو پھر آواز دی تھی، آپ نے جواب نہ دیا؟"
میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا۔ "اوہو۔ لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈمارننگ کہا تھا؟ میں تو پلٹے می سے جاگ رہا تھا"۔
بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں--- اس کے بعد!--- کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی، آپ بولے می نہیں۔"
ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہوگئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوریاں چڑھائےغوروفکر میں مصروف ہوگئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکایک ایک محجومانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکراکے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اس وقت--- اے--- اے، نماز پڑھ رہا تھا۔"
لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیئے۔ اور ہم اپنے زہد واتقا کی مسکینی میں سر نیچا کئے کمرے کی طرف چلے آئے۔ اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہوگیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جگانا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران لالہ جی آواز دیں تو نماز۔
جب دل مرحوم ایک جہان آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرق ناز محو بالش کمخواب" ہو اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں۔ اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو!
تم جاگو مومن پیارے
خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہوجائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کردے چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہوجائیں۔ دلآویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کردے۔ اور گیت "سانوری صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم وحجاب میں ڈوب جائے۔
نصیب یہ ہے کہ پلٹے "مسٹر! مسٹر!" کی آواز اور دروازے کے دنادن

سامعہ نوازی کرتی ہے، اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کردیتا ہے۔ اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑویوں کے گرنے۔ دیگچیوں کے اُلٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کُلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کرلیجیئے کہ ان سازوں میں سُرتال کی کس قدر گنجائش ہے!

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبعیت کو دیکھتا ہوں میں

* * *

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہےبڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیداور پیدا

کتے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سرکھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کافائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔تو ہم لنڈورے ہی بھلے، کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں ایک کتے نے مطلع عرض کردیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف ایک قدر شناس کتےنے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہواکہ کچھ نہ پوچھئے، کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے، وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن کبھی ایسے موقعوں پر پر دھان کی بھی کوئی بھی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھئے کہ میاں تمہیں کوئی ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جاکر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

اورپھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا، خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے اندر داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں کھڑے کھڑے ہی ایک ہلکی سی "بخ" کردی اور پھر منہ بند کرکے کھڑا ہوگیا۔ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کردی۔ چوکیداری کی

چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر ۔ نہ سر نہ پیر ۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں، بےتالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں، نہ وقت پہچانتے ہیں، گل بازی کیے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجیئے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی سیتا گری سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیئے کہ دافع بلیات ہے لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ اگر ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے ایسے موقع پر کبھی گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سُروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیت الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجےچھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آرہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نومشقی کا عالم بھی ہے اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بےسرے بھی ہوگئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے، اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا، ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش دھیمی دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول، زاویئے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھر تھرتھرا کر خاموش ہوگئی لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔گویا ایک بےآواز لے ابھی تک نکل رہی ہے ۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق

نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن---

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصُر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں اور بوڑھوں سب ہی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چاروناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہئیے۔) لیکن یہ کم بخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنےآکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہوتو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کردیں لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کردے گا؟

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قو 'ی معطل کردیتی ہے خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ بامر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کردے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرلب) بےڈھنگی حرکات وسکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری۔) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کرسکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارلے گا؟ بہرصورت کتوں کی یہ پرلےدرجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چون وچرا کئے واپس لوٹ جائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزاردی ہیں لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان

کا کوئی عزیزومحترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں۔)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلئیے سے مستثنٰ "ی نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا، اس کے جسم میں تپّسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارگناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غوروفکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بندکرلیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو آپ نے سرکو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا ۔ صورت حال کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیاتو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر ایک گز پرے جالیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کردیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی، تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک، پتلی سی دم کو تابحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انہوں نے غیظ وغیب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کردی، "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے، نظر نہیں آتا، ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں"۔ بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہوجاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں کہ بےشمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوائن میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعل 'ی قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے، تو جنون انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔ ا یک شعر ہے:

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے، جو ایشیا کے لیے باعث ننگ ہے، انگریزی میں ایک مثل ہے، کہ "بھونکتےہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے" یہ بجا سہی۔ لیکن کون جانتا ہے، کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کردے، اور کاٹنا شروع کردے!

اردو کی آخری کتاب
ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے:

۱۔ وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

۲۔ بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

۳۔ دولہا کب بنے گااور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ہم کب بڈھے ہوں گے؟

۵۔ تو کب کمائے گا؟

۶۔ آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتاہے اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو ماں کا دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے۔ تو یہ بےچین ہوجاتی ہے۔ سامنے پنگورا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو، تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے ۔(باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کچی نیند میں رونے لگتا ہے۔ تو بےچاری مامتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک اور اُبال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اُٹھ بیٹھتی ہے، اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کرکے کہتی ہے کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا واہ واہ۔

کھانا خودبخود پک رہا ہے

دیکھنا۔ بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن صندوق پر چُنے ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے، ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے اور کسی میں آٹا، کسی میں چوہے، پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے تاکہ جب چاہے آگ جلائے، جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا

گندھا رکھا ہے، چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر چڑھی ہے۔ غرض یہ کہ سب کام ہوچکا ہے۔ لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے تو کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے کبھی نہیں رکھتی، کھا چکتا ہے۔ تو کھانا اُٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھی ہے۔ کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے، کیوں نہ ہو، مہاتماگاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں۔ آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے، دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے، کبھی دریا پر تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے، گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔ صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے آئی، اب تک پانی میں کھڑا ہے اس کو ضرور سرسام ہوجائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے۔ جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے اس پار ایک گلہری دوڑ رہی ہے۔ دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑے پٹرے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے۔ اب دھوبن گانا گائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہوجائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کہاوت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے دیکھئے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں، کیا مجال کوئی پاس تو آجائے، جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لےجاسکتے۔ میاں دھوبی! تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو، ننگا پھراتے ہو۔

***

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع وفرمانبردار، اپنی بیوی روشن آراء کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصول زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات وخصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آراء کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کررکھا ہے انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعث ذلت سمجھتی ہیں۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں، جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جاسکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیئے، اچھے خاصے اور بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل وصورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا ٔ وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں، ان ہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہوجائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں، لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے وہ ہمارے گھر میں "موئے کبوترباز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آراء کو فوراً خیال ہوجاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوترباز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہوجاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں، کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا، تو میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا، آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا، نہیں آتے تم باہر آؤ۔ خیر اندر گیا۔ بدن پر تیل

مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے بیٹھ جاؤ ہم نے کہا، بیٹھیں گے نہیں، آخر بیٹھ گئے معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے، مرزا بولے کیوں بھئی؟ خیرباشد! میں نے کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو، پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں، آخر ہم نے کہا۔

"مرزا، بھئی کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کرکے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یوں ہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہوگئی۔ ہم نے کہا، چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہوگئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہوچکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگاسکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہےاور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے، سردی کا موسم ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری۔۔۔"اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا، اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آراء نے مجھ سے میکے جانے

کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، روشن آراء صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کرسکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہوگئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بےشک دوست آئیں، بےشک ادھم مچائیں، میں بےشک گاؤں، بےشک جب چاہوں اُٹھوں، بےشک تھیٹر جاؤں، میں نے کہا۔

"روشن آراء جلدی کرو، نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔" ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کراچکا تو کہنے لگی "خط روز لکھتے رہئے!" میں نے کہا"ہر روز اور تم بھی!"

"کھانا وقت پہ کھا لیا کیجیئے اور ماں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں"۔ اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا، تہہ کرکے جیب ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں، چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں، دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔ کہتے ہیں، جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان وشوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا، آزادی کے لمحہ میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہوگیا۔ سگریٹ سلگا لیا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہوگیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا، تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا، باہر ہی سے نوکرکو آواز دی۔

"امجد"

"حضور!"

"دیکھو، حجام کو جاکے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لی نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہوجائے۔"
"بہت اچھا حضور۔"
"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے، تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"
یہاں سے کلب پہنچے، آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا، اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام ونشان تک نہیں سب کمرے دیکھ ڈالیے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کررہا تھا۔ اس سے پوچھا"کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"
کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں، اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"
بہت مایوس ہوا باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے، دفتر پہنچا دیکھ کر بہت حیران ہوئے، میں نے سب حال بیان کیا کہنے لگے۔ "تم باہر کے کمرے میں ٹہلو، تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں، شام کا پروگرام کیا ہے؟"
میں نے کہا۔ "تھیٹر!"
کہنے لگے۔ "بس بہت ٹھیک ہے، تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔"
باہرکے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی، اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کردیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا، پھر سے پڑھنا شروع کردیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالےاور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔
آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔
جمائی پہ جمائی۔
جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔
اس کے بعد ٹانگیں ملانا شروع کیں لیکن اس سے بھی تھک گیا۔
پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔
بہت تنگ آگیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا۔ "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا، مردود کہیں کا، سارا دن میرا ضائع کردیا۔"
وہاں سے اُٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا۔ اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے، رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے، تکئے پر سر رکھا ہی تھا، کہ نیند نے بےہوش کردیا۔ صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ماتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر

طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔
گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا کھنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"
ہم نے کہا۔ "یہیں بلا لاؤ"۔ یہ عیش مدت بعد نصیب ہوا، کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں، اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کےلیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی، جس کی امید لگائے بیٹھے تھے، چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال۔ دل میں آیا، وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو دیکھتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر آیا۔ باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا دل بھرآیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہوگیا۔ اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بےقرار ہوتا گیا۔
آخر نہ رہا گیا، باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں تم فوراً آجاؤ!
تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا، یقین تھا کہ روشن آراء اب جس قدر جلد ہوسکے گا، آجائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔
دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی، سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔
اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معقول طریقے سے قواعدوضوابط کے مطابق اور متانت وسنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی، یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کردیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اُڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہےپر قہقہے اُڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ملا ملا کر گا رہا ہے کوئی فرش پر بازو ٹیکے بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہورہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا، ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک

ایسا کھیل تجویز کردیا۔ جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے مار جاتا ہے۔ وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے"۔ ایک بولا۔ "پھر آج جو چور بنا، اس کی شامت آجائے گی"۔ دوسرے نے کہا۔ "اور نہیں تو کیا بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے!"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے، "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کر لائے"۔ کوئی کہے، "نہیں حضور، سب کے پاؤں پڑے، اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے۔ "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ اور یہ اس حالت میں جاکر اندرسے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا۔ "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے! واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے، ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی، ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن پر پہنچےہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی، منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آراء!

دم خشک ہوگیا، بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہوگیا، زبان بند ہوگئی، سامنے وہ روشن آراء جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں اور اپنی یہ حالت کو منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں، اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہوگئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آراء کچھ دیر تک چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی--- لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے، کہ میں بذات خود از حد شریف واقع ہوا ہوں، جہاں تک میں، میں ہوں مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کرسکتی، میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے۔ اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کردیا ہے۔ اس لیے میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے

کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا سوائے ڈاکیے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ماں"

"دے جاؤ، چلے جاؤ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

بس، اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا، آپ دیکھئے تو سمیٔ!

* * *

مریدپور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات کا تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات کو ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے وہاں کہیں ملازم تھا، غبن کا الزام لگا، مجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے۔ اور میں تو اس کے نزدیک بس علم وفن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں شائستہ سے شائستہ دو زمانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا، کہ ان پر پنچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں، میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ اعلان کرچکا ہوں، اور اب میں ببانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لیے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرالیا لیکن یہ محض حاسدوں کی بدطینتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے، زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا چنانچہ میں نے مشغلہ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر

تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آکر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔
بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بےحد ادب واحترام کے ساتھ کھولتے، بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کرلیتے۔ خط کو خود پڑھتے پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے پھر مقامی اخبار کے بےحد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کردیتے جو اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام"مریدپور گزٹ" ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں، دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔ رنگ گندمی، گفتگو فلسفیانہ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مریدپور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچادیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔
یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مریدپور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انشاء پردازی، صحیح الدماغی اور جوش قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھ کو مریدپور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مریدپور گزٹ میں چھپتی رہیں۔
میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بےخبر تھا۔ سچ ہے خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ میں نےاپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کرلیا ہے۔ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں میں سے گزر جاتا ہے مرید پور میں پوُجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگریس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کرچکا تھا۔ مریدپور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے بھی برسبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہوگئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کرکے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔
کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جابجا جلسے نکل

آئے جس کسی کو ایک میز، ایک کرسی اور گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کردیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مریدپور کی انجمن نوجوانان ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ دمہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کےلیے بےتاب ہیں۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی ازحد ضرورت ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ "خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر۔۔۔" اسی طرح کی تین چار برامین قطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آکر لوگوں کو ہندومسلم اتحاد کی تلقین کریں۔
خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیا تو رفتہ رفتہ باشندگان مریدپور کی مردم شناسی کا قائل ہوگیا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحے ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہل وطن کی بےحسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بیچاروں کی بہبود اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزارہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اُٹھ کہ سینکڑوں لوگ تیرے لیے ماحضر لئے بیٹھے ہوگے۔ چنانچہ میں نے مریدپور کی دعوت قبول کرلی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی، کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مریدپور پہنچ جاؤں گا، اسٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔
اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کردیا، طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح وشام پھرتے رہے۔
"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"
"ہندو مسلم شیروشکر ہیں۔"
"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندواور مسلمان ہی تو ہیں۔"
"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا، وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنہوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"
بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا" والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کرلیا۔ پھر یاد آیا، کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی، جس

میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ا یک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو۔ وہ توڑ نہیں سکے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کرتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا، تقریر کا آغاز سوچا۔ سو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ:

"پیارے ہم وطنو!"

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہوگئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایہ ناز شاعر یعنی الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلمبند کئے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا، کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا، اس کے المناک الفاظ روزبروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے--- وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا، افلاس، غربت، بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر پوچھوں گا، کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا، جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیرملکی حکومت، آب وہوا، مغربی تہذیب۔ لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا، اور پھر اصل وجہ بتاؤں گا کہ اصل وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے، آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا کہ:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کرلینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنایا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کیا، تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا،

(۱) تمہید اشعار حالی۔ (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو۔)
۲) ہندوستان کی موجودہ حالت۔
(الف) افلاس
(ب) بغض
(ج) قومی رہنماؤں کی خودغرضی

۳) اس کی وجہ۔
کیا غیرملکی حکومت ہے؟ نہیں۔
کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں۔
کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں۔
تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ، جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو۔)
(۴) پھر بتاؤ، کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ (نعروں کے لیے وقفہ۔)
اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔
(اس کے بعد شاید پھر چند نعرے بلند ہوں، ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ۔)
(۵) خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصیات اتحاد کی تلقین، شعر
(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو۔)
اس خاکے کے تیار کرچکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ نمبر ۳ کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب تک پہنچ سکے اور سب اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن سکیں۔
مریدپور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہار پہنائے۔ اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگا سے مریدپور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مریدپور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیئر تھے، انہوں نے کہا، "سر باہر نکالئے، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے۔ ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا، مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایاگیا۔ اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف پایا۔
جلسہ گاہ میں داخل ہوئے، تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگاتا رہا تھا۔ دائیں بائیں، سرخ سرخ جھنڈیوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ "مثلاً ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے۔" "مریدپور کے فرزند خوش آمدید۔"

"ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔"
مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھے سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ماتھ کو بوسہ دیا اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:
"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے---"
تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ماتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ماتھ پاؤں میں یک لخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو، ابھی اور کئی جیبیں ہیں گھبراؤ نہیں رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن کاغذ کہیں نہ ملا۔تمام مال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا، دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا، ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ماتھ نہ آیا جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کردوں۔ بےبسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا، صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔
مریدپور کا شہر ان پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کی ذات نوع انسان کے لیے---"
خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ اس سے پہلے یہ بتانا ہے، کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیرموزوں ہوگا، جاہل کہنا چاہیئے، یہ ٹھیک نہیں، غیرمہذب۔
"ان کی اعلیٰ سیاست دانی، ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں، لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے---"
ہاں وہ تقریر کا ہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندومسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں، لیکن وہ تو آخر میں ہیں، وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟
"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ آپ کے دل ملا دیں گے، اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے---"
صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہورہی تھی اتنے میں صدر نے مجھ سے کچھ کہا مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا، پھر سنبھل گیا۔ میرا ماتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں شور

تھا، میں بیہوشی سے ذرا ہی دور تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خودغرضی بھی بیان کرنی ہے۔ اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی بگلے اور لومڑی کی کہانی۔ نہیں ٹھیک ہے دو بیل۔۔۔"

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا، وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے میز بھاگنے کو ہے۔ اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی، گلا خشک تھا، بصد مشکل میں نے یہ کہا۔

"پیارے ہم وطنو!"

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کرکے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی، اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی، تو میں نے کہا۔

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد ذرا دم لیا، اور پھر کہا، کہ:

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ نہ آیا، کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ سینکڑوں باتیں دماغ میں چکر لگارہی تھیں، لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا، کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا، ایک دفعہ تقریر شروع کردوں، تو پھر کوئی مشکل نہیں رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے، کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں۔۔۔ سمجھے آپ؟ (وقفہ۔۔۔) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نےاشارہ کیا ہے گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے، سمجھ میں نہ آتا تھا، کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی، اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔ "ہاں تو بات دراصل یہ ہے، کہ ایک جگہ دو بیل اکھٹےرہتے تھے، جو باوجود آب وہوا اور غیر ملکی حکومت کے۔" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا، کہ کلام کچھ بےربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کردیں۔
"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیئے لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں، اس لئے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھئے نا۔ کہ اگر۔" (بلند اور طویل قہقہہ)
"حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے۔ (قہقہے اور شور وغوغا۔۔۔ اسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے ہیں۔)
شیخ سعدی نے کہا ہے۔ کہ:
چو از قوم یکے بیدانشی کرد
(آواز آئی کیا بکتا ہے۔) خیر اس بات کو جانے دیجیئے۔ بہرحال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔ کہ:
آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے دل پکار میں چلاؤں ہائے گل
اس شعر نے دوران خون کو تیز کردیا، ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہوگیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا:
"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں، ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں۔ اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی۔) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خودغرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے، کہ زندگی کے وہ تمام شعبے ۔۔۔"
لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہوگئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے ہلکے قطرے کی طرح ہمت کرکے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد اسٹیج پر آگریں، لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔
"حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہوجاؤ گے! تم دو بیل ہو۔۔۔"
لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی ، تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا، اور زقند بھر کے دروازے میں باہر کا رخ کیا، ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کردی۔ اور سیدھا

اسٹیشن کا رخ کیا، ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی میں بےتحاشہ اس میں گھس گیا، ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔
اُس دن کے بعد آج تک نہ مریدپور نے مجھے مدعو کیا ہے۔ نہ مجھے خود وہاں جانے ک

انجام بخیر

منظر۔۔ ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور لرزہ براندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔
زمین پر ایک چٹائی بچھی ہے جس پر بےشمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر، ٹالسٹائے، ورڈزورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔ باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔ قریب ہی ایک بارات اُتری ہوئی ہے۔ اس کےبینڈ کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق، دمہ، کھانسی اور اس طرح کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔
پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گزشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں،آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔ سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔
باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اُٹھ کر دروازہ کھول د یتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلٰی لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔
پطرس۔۔ حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ وحشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے، لہذا اے میرے فرزندو، اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کرلو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چُن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔
(کمرے میں ایک پراسرار سا نور چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)۔
طالب علم۔۔ (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے۔ اے ہمارے محترم استاد۔ ہم تمہارا حکم مانےکو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔
(کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں)
پطرس۔۔ کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟
پہلا طالب علم۔۔ اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ اتارنے آئے ہیں۔
دوسرا طالب علم۔۔ اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔
تیسرا طالب علم۔۔ اے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس۔۔ یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہوگیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ! تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم وتدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم۔۔ (سروقد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد!ہم علم کی بےبہا دولت سے محروم تھے، درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پولیس اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اجالا ہوگیا۔ مقتدر معلم! تو جانتا ہے، آج مہینے کی آخری تاریخ ہے، ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تجربے اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کرسکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں اسے قبول کر کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس۔۔ تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بےقراری میرے جسم پر طاری ہوگئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بامر بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)۔

پہلا طالب علم۔۔ (آگے بڑھ کر) اسے ہمارے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول کر۔ (بڑے ادب واحترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم۔ ۔ (آگے بڑھ کر) اسے فرشتے میرے ہدیےکو شرف قبولیت بخش۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم۔۔ (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان مجھ ناچیز کو مفتخر فرما۔ (اٹھنی پیش کرتا ہے)۔

پطرس۔۔ (جذبات سے بےقابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو! خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو۔ اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے۔ (تینوں اٹھنیاں اُٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)۔

طالب علم۔۔ (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم فرض سے سبکدوش ہوگئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لیے بےتاب ہوں گے۔

پطرس۔۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی

بڑھتی رہے۔
(طالب علم چلے جاتے ہیں)۔
پطرس۔۔ (تنہائی میں سربسجود ہو کر) باری تعالٰی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمر کے لیے بہت دنوں انتظار میں نہ رکھا۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں لیکن ہماری کم مائیگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل وکرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تونے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔
(کمرے میں پھر ایک پراسرار سی روشنی چھا جاتی ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)۔
کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے۔
پطرس۔۔ اے خدا کے دیانت دار اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آئیو!
ملازم۔۔ (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آوں گاکہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔
(ایک طویل وقفہ جس کے دوران درختوں کے سائے پہلے سے دگنے لمبے ہوگئے ہیں)۔
پطرس۔۔ آہ انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔
(سربسجود گر پڑ تا ہے)۔
پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اٹھنیوں پر نظر پڑتی ہے ان کو فوراً کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے۔
پطرس۔۔ آہ! مجھے زرودولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کی لالچ سے پاک رکھیو!
(ملازم اندر آتا ہے)۔
پطرس۔۔ اے مزدور پیشہ انسان مجھے تم پر رحم آتا ہے کہ ضیائے علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تاہم خداوند تعالٰی کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں، تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے، تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آگیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر اور باقی کے ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفہ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔
(ملازم اٹھنیاں زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ بینڈ

زور سے بجنے لگتا ہے)۔
پطرس۔۔ خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ اور ادنٰی طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ! (پھر کام میں مشغول ہوجاتا ہے)۔
باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آرہی ہے۔۔۔ ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے چوگنے لمبے ہوگئے ہیں۔ بینڈ بدستور بج رہا ہے۔ یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آکر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے۔
پطرس۔۔ (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟
ایک آواز۔۔ (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بدستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں اور عرض حال کروں۔
پطرس۔۔ (دل میں) میں اس آواز سے ناآشنا ہوں لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آجایئے۔
(دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے لیکن نظریں زمین دوز ہیں۔ ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)۔
پطرس۔۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے لیکن جاہ وحشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہذا اے محترم اجنبی اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کرلو اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔
اجنبی۔۔ اے برگزیدہ شخص میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔
پطرس۔۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟
اجنبی۔۔ اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبہ تعلیم کا افسر اعلٰی ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم وفضل کے صدقے معاف کردو۔
(آبدیدہ ہوجاتا ہے)۔
پطرس۔۔ اے خدا کیا یہ سب وہم ہے کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں!
اجنبی۔۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے لیکن مجھ پر یقین کرو میں فی الحقیقت یہاں تمہاری

خدمت میں کھڑا ہوں اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکہ نہیں دے رہیں۔ اے شریف اور غم زدہ انسان یقین نہ ہوتو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان لے لو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی بہت زور سے چیختا ہے)۔

پطرس۔۔ ہاں مجھے اب کچھ کچھ یقین آگیا ہے لیکن حضور والا آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانامیرے لیے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی۔۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گزشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس۔۔ (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی۔۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں البتہ ایک عرض ہے اگر آپ منظور کرلیں تو میں اپنےآپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس۔۔ آپ فرمائیے میں سن رہا ہوں گو مجھے یقین نہیں کہ یہ عالم بیداری ہے۔

اجنبی تالی بجاتا ہے چھ خدام بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجالا کر باہر چلے جاتے ہیں۔

(صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ معظم۔۔ شاہزادہ ویلز، وائسرائے ہند اور کمانڈرانچیف ان چاروں کی ایما پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم وفضل کی قدردانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں (بھرائی ہوئی آواز سے) ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس۔۔ (صندوق کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا (آیت الکرسی پڑھنے لگتا ہے)۔

اجنبی۔۔ ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔ (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)۔

(گانا۔ آج موری انکھیاں پل نہ لاگیں)۔

پطرس۔۔ اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں اور تو کیوں گا رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کہ ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں چارپانسو روحوں کو خواب جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی۔۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس۔۔ خدا تمہارا حامی وناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہوجاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پراسرار نور چھا جاتا ہے۔ اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ بامر بینڈ بدستور بج رہا ہے)۔

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجب ہوس خیز ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی۔ کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ارمان انگیزی ہے میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا مورد عتاب رہ چکا ہوں لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کے طفیل سینما گویا میری دکھتی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سن پاتا ہوں بعض دردانگیز واقعات کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی کج بین بن گئی ہے۔ اول تو خدا کے فضل سے ہم کبھی سینما وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں لیکن خدا شاہد ہے ان کی دوستی سے جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضہ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما جانے کا ارادہ ہو ہفتہ بھر پہلے سے انہیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کوئی حرج واقع نہ ہو لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں:

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سےآج تک ایسی بےمروتی بھی برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہوجاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں:

"بھئی اب کے ہوسکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہوجاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں:

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہےنا؟"

مرزا صاحب عجیب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔ "بھئی ہمیں یہ معلوم نہیں۔"

"میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے۔"

"اب تمہارے خیال کی تو کوئی سند نہیں۔"

"نہیں مجھے یقین ہے چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"
"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"
اس کے بعد آپ ہی کہئے میں کیا بولوں؟
خیر جناب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہوجاتا ہوں اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کراکے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی آخر تنگ آکر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتاہوں پھر سگریٹ سلگا لیتا ہوں اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر اُدھر جھانکتاہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آجاتا ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کردیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں۔ یا نما رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں۔ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج ہر واپس آجاتی ہے آخرکار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون پر قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:
"کیوں حضرات آپ اندر ہی تھے؟"
"ہاں میں اندر ہی تھا۔"
"میری آواز آپ نے نہیں سنی؟"
"اچھا یہ تم تھے؟ میں سمجھا کوئی اور ہے؟"
آنکھیں بند کرکے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:
"تو اچھا اب چلیں گے یا نہیں؟"
"وہ کہاں"؟
"ارے بندہ خدا آج سینما نہیں جانا؟"
"ہاں سینما۔ سینما۔ (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے۔ سینما۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی اچھا ہوا تم نے یاد دلایا ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔"
"تو چلو پھر اب چلیں۔"
"ہاں وہ تو چلیں ہی گے میں سوچ رہا تھا کہ آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے

دھوبی کم بخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں۔ یار ان دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔"
اگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہوجاتا لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں بےبس ہوتا ہوں صرف یہی کرسکتا ہوں کہ: "مرزا بھئی للہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما چلنے کو آیا ہوں دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بڑے بدتمیز ہوپونے چھ بج چکے ہیں اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"
مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمہاری طفلانہ خواہشات آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر اندر تشریف لےجاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔
مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا قانون کی رو سے انہیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں دوسرا ہاتھ میں، میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آجاتا ہوں مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید رہےہوتے ہیں۔ "ارے بھئی چلو۔"
"چل تو رہا ہوں یار، آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"
"اور یہ تم کیا کر رہے ہو؟"
"پان کے لیے ذرا تمباکو لے رہا تھا۔"
تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چارپانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں وہ ساتھ آملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کردیتا ہوں پھر آگے نکل جاتا ہوں پھر ٹھہرجاتاہوں۔ غرض یہ کہ گو چلتا دوگنی تگنی رفتار سے ہوں لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔
ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ، بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کردو جی!" یااللہ اب جاؤں کہاں۔ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی، کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں تو سر ان بالٹیوں سے جاٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں، تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں، اس کے پاؤں کو پھاند کر اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا۔خواتین کے گھنٹوں سے دامن بچا۔ آخرکار کسی گود میں جاکر بیٹھتا ہوں وہاں سے

نکال دیا جاتا ہوں اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جاپہنچتا ہوں مرزا صاحب سے کہتا ہوں: "میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو خوامخواہ میں ہم کو رسوا کروادیانا! گدھا کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں اور جن کو مخاطب کررہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔ اب تماشے کی طرف متوجہ ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کون سا ہے اس کی کہانی کیا ہے اور کہاں تک پہنچ چکی ہے اور سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغلگیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے کہ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرات ایک وسیع وفراخ انگڑائی لیتے ہیں جس کے دوران میں کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو لپیٹ لیتے ہیں تو سر کو کھجانا شروع کردیتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے خمیدہ رکھتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کرکے چائے دانی کے اس دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہے چنانچہ وہ دائیں سے ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک دو لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کرجاتا ہے چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ دل لگی یوں ہی جاری رہتی ہے وہ دائیں تو میں بائیں اور وہ بائیں تو میں دائیں ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جابیٹھوں۔ اور کہوں کہ لے بیٹا دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے: "یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔"

اس کے بعد غصے میں آکر آنکھیں بند کرلیتا ہوں اور قتل عمد، خودکشی، زہرخورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہے۔ دل میں، میں کہتا ہوں کہ ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔ اور اگر آیا بھی تو اس کم بخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آجاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا رہوں گا! ہمت بڑے طرے والی پگڑے پہن کر آؤں گا اور اپنے اوورکوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا

دوں گا! بہرحال مرزا کے پاس تک نہیں پھٹکوں گا!
لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھی فلم کا اشتہار
دیکھ کر پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں
سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں بھئی اگلی جمعرات سے سینما چلو گے نا؟

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی، لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لیے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہوجاتی تھی۔ اس کےعلاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا، میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار اکثر گیلریوں یا کنسرٹوں میں اکھٹے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث ومباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر کوئی نئی کتاب یا نیا "مصنف" دریافت کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کردیتا۔ اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویئے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کردیتے تھے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایات کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنف ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کرلیتا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔ خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤاجداد کا خون جوش مارتا اور میرا دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرح میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظرانداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی، اور ہفتہ بھر کے بعد انہیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انہیں پڑھ چکی ہوں۔ تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اول تو میرے لیے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا، لیکن فرض کیجیئے مردوں کی لاج رکھنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کرکے ان سب کو پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضروری ایسی ہوتیں کہ ان کو سمجھنے کے لیے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتے بھر کی جانفشانی کے بعد ایک عورت کے سامنے اس

بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی، میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا، اور وہ نہایت عالمانہ انداز میں بھنویں اوپر کو چڑھا چڑھا کر باتیں کرتی۔ جب میں اس کے لیے دروازہ کھولتا یا اس کے سگریٹ کے لیے دیا سلائی جلاتا یا اپنی سب سے زیادہ آرام دہ کرسی اس کے لیے خالی کردیتا تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔ میبل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہوجاتی۔ جان یا مال کا ایثار سہل ہے، لیکن آن کی خاطر نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے۔ لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب میبل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نےنہیں پڑھی تھیں، ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کردی۔ لیکن جو کچھ کہتا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا تفصیلات کے متعلق کوئی بات منہ سے نہ نکالتا تھا، سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میبل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لاابالیانہ کہا:

"ہاں اچھی ہے، لیکن ایسی بھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطہ نظر کچھ نبھ نہ سکا، لیکن پھر بھی بعض نکتے نرالے ہیں، بری نہیں، بری نہیں۔"

کنکھیوں سے میبل کی طرف دیکھتا گیا لیکن اسے میری ریاکاری بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا:

"ہاں پڑھا تو ہے لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میبل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا:

"اس نقاد پر اٹھارہویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یوں ہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے، بہت دلچسپ، بہت دلچسپ۔"

رفتہ رفتہ مجھے اس فن پر کمال حاصل ہوگیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کرسکتا تھا اور اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا، اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں میبل سے نہ دبتا تھا، اسے بھی میرے علم وفضل کا متعارف ہونا پڑا۔

وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی، تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں کی رائے زنی کرسکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احسان فتح مندی سے بالیدگی سی آگئی تھی۔ اب میں اس کے لیے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت وبرتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں، لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لیے مجھ پر دھڑی دھڑی لعنتیں بھیجیں گی کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکہ دیا۔ ان کی تسلی کے لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانئے کئی دفعہ تنہائی میں، میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھلانا بھی مشکل ہوگیا کہ میں بغیر پڑھے ہی علمیت جتاتا رہتا ہوں، میبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے تو بہرحال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے، میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن حقیقت تو یہی نا کہ میں وہ کتابیں نہیں پڑھتا، میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی، میرے اپنے نزدیک تو مسلّم ہے۔ اس خیال سے اطمینان قلب پھر مفقود ہوجاتا اور اپنا آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا۔ اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میرا دل زیادہ نرم ہوجاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سےآنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے لیکن اُس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ ان ہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا، مطلق نہ تھا، بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا، تمام گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی، اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ وتاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی، دوا پلائی، ماتھے پر ہاتھ رکھا، میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا، (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) "میبل مجھے خدا کے لیے معاف کر دو۔" اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کردی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا، جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی

تھیں۔ میں نے کہا "میبل، پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں، ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا، میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی، جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا۔"
کہنے لگی۔ "نہیں تو"۔
میں نے کہا۔ "مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا، کریکٹروں کے متعلق جو کچھ بک رہا تھا وہ سب من گھڑت تھا۔"
کہنے لگی۔ "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"
میں نے کہا۔ "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟"
کہنے لگی۔ "ہاں، پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"
اس کے بعد میری گزشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی۔ "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"
میں نے کہا۔ "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو، میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا لیکن اب انہیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انہیں پڑھ چکی ہو۔"
کہنے لگی۔ "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔"
اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا، تینوں میں سے کسی کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انہیں ابھی تک نہ پڑھا تھا!
مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہوجائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹرکار گزرجاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹرکار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے۔ اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جاسکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گردوغبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلّی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آکر علم کیمیا کی وہ کتاب نکل لیتا ہوں جو میں نے ایف۔اے میں پڑھی تھی۔ اور اس غرض سے اُس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آجائے۔

میں کچھ دیرتک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مرزا صاحب۔ ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے۔ "بھئی کچھ ہوگا ہی نا آخر۔"

میں نے کہا۔ "میں بتاؤں تمھیں؟"

کہنے لگے۔ "بولو"۔

میں نے کہا۔ "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں--- کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو۔ کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کے دم ہوتی ہے۔ تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں اور میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہوجاؤ۔ تم کچھ نہیں کرسکے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اور اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔

پیدل-- تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں ایک ضرور زمین پر رہے۔ یعنی

تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے، ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہوجاتے ہیں۔ تخیل مرجاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہوجاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بےپروائی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بےوفائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے ازحد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا۔ "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت پیچ کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرادیا لیکن میرے تبسم کا میں زہر ملا ہوا تھا۔

جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہوگیا تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹرکار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا پھر بولے۔ "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا۔ "سنا نہیں تم نے۔ ایک موٹرکار خریدنے لگا ہوں۔ موٹرکار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو، اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کردیئے۔ تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے"۔

مرزا بولے۔ "ہوں"۔

اب کے مرزا نہیں میں بےپروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ پھرسگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور لے جاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا بولے۔ "ہوں"۔

میں سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا، مرزا کچھ بولے۔ تاکہ مجھے معلوم ہو، کہاں تک مرعوب ہوا ہے لیکن مرزا نے پھر کہا۔ "ہوں"۔

میں نے کہا۔ "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔

پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے، اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"
مرزا صاحب کہنے لگے۔ "نہیں یہ بات تو نہیں، میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹرکار خریدنے لگا ہوں تو میاں صاحب زادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"
یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا۔ "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"
مرزا بولے۔ "کون کون سی مثلاً؟"
میں نے کہا۔ "ایک تو میں سگریٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔"
مرزا کہنے لگے۔ "چلو دس آنے تو یہ ہوگئے، باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی طرح ہوجائے تو سب کام ٹھیک ہوجائے گا۔"
اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔
مرزا بولے۔ "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں ایک بائسیکل لے لو۔"
میں نے کہا۔ وہ روپیہ کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔"
کہنے لگے۔ "مفت"۔
میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "مفت وہ کیسے؟"
کہنے لگے۔ "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔"
ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں، اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی، بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہوجانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں، تو میں نے پوچھا۔
"کس کی؟"
مرزا بولے۔ "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہےتم لے لو۔"
میں نے کہا۔ "پھر کہنا پھر کہنا!"
کہنے لگے۔ بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے جب میری ہے، تو تمہاری ہے، تم لے لو۔"

یقین مانئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہوگیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بےغرضی اور ایثار بھلا کماں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کرلی، سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا۔ "مرزا صاحب سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور درشتی اور بےادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں، جو ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی، دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کردوگے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خودغرض اور عیار انسان سمجھتارہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہومی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کردیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں، مجھے معاف کردو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھا دیتا، لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ اس میں میری فیاضی کیا ہوتی، میرے پاس ایک بائیسکل ہے، جیسے میں سوار ہوا، ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا۔ "مرزا، مفت میں نہ لوں گا، یہ ہر گز نہیں ہوسکتا۔"

مرزا کہنے لگے۔ "بس میں اسی بات سے ڈرتا تھا، تم حساس اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے حالانکہ خدا گواہ ہے، احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "خیر کچھ بھی سہی، تم سچ مچ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے۔ "قیمت کا ذکر کرکے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی، وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنےکی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے، "میں نے پورے دو سو روپے میں لی تھی، لیکن اُس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا، اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے۔ "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی، میرا لڑکا اس پر کالج آیاجایا کرتاتھا، اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے، آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہے۔ جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خریدلیتے ہیں۔ پرانی

بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"
"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا، اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"
مرزا کہنے لگے۔ "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں، اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن۔۔۔"
میں نے کہا۔ "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں تم گھر جاکے گن لینا، اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا ورنہ روپے واپس کردینا، اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں، یہ تو کچھ دکان داروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"
مرزا بولے۔ "بھئی جیسے تمہاری مرضی، میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"
میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا، میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا، وہ بیچارہ تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو، لیکن مفت میں کیسے لے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست وبود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پنتالیس یا پچاس ہوں، جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اور اگر پنتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں بس ٹھیک ہے، چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کرلے۔
بامر آیا چالیس روپے مٹھی میں بند کرکے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا۔ "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوادینا"۔
مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح ہی صبح بھجوا دینا رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا۔ "کل صبح آٹھ نو بجےتک پہنچ جائے، دیر نہ کردینا۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا۔۔۔ خداحافظ۔۔۔ اور تمہارا بہت بہت شکریہ، میں تمہارا بہت ممنون ہوں اور میری گستاخی کو معاف کردینا، دیکھونا کبھی کبھی یوں ہی بےتکلفی میں۔۔۔ کل صبح آٹھ نو بجے تک۔۔۔ ضرور۔۔۔ خداحافظ۔۔۔"

مرزا کہنے لگے۔ "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو خود ہی ڈلوادوں گا، ورنہ تم خود ہی ڈلوا لینا"۔
میں نے کہا۔ "ہاں ہاں وہ سب کچھ ہوجائے گا، تم کل بھیج ضرور دینا اور دیکھنا آٹھ بجے تک ساڑھے آٹھ سات بجے تک پہنچ جائے۔ "اچھا۔۔۔ خداحافظ!"
رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کرلیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہوسکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح کی ہوا خوری کے لیے ہر روز نہر تک جایا کروں گا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزرجاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اُٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اُڑ رہاہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کرچکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر اؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگالوں۔
رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہوجائے۔ صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کے حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔ میں نے کہا۔ "اتنے سویرے؟"
نوکر نے کہا۔ "وہ تو رات ہی کو آگئی تھی، آپ سو گئے تھے میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی یہ ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے"۔
میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے بائیسکل بھجوادینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپےلے لیے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔
نوکر سے کہا۔ "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو۔ اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو، اے بھاگا کہاں جارہا ہے ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں، بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے۔ جس سے تمام پرزے ہی خراب ہوجائیں، بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں اور بائیسکل باہر نکال رکھو، ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو

جارہےہیں اور دیکھو صاف کردینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا، بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے"۔
جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا اس کے بعد کپڑے بدلے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔
برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب وغریب مشین پر نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے، نوکر سے دریافت کیا۔
"کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"
نوکر بولا۔ "حضور یہ بائیسکل ہے"۔
میں نے کہا۔ "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"
کہنے لگا۔ "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لیے"۔
میں نے کہا۔ "اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"
کہنے لگا۔ "یہی تو ہے"ے۔
میں نے کہا۔ "کیا بکتا ہے جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیسکل یہی ہے؟"
کہنے لگا۔ "جی ہاں"۔
میں نے کہا۔ "اچھا" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔ اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"
"اس کو دو تین دفعہ صاف کیا ہے؟"
"تو یہ میلی کیوں ہے؟"
نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔
"اور تیل لایا؟"
"ہاں حضور لایا ہوں"۔
"دیا"؟
"حضور وہ تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں وہ نہیں ملتے"۔
"کیا وجہ ہے؟"
"حضور دُھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں"۔
رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا تو ثابت ہوگیا کہ یہ بائیسکل ہے لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ بل اور رہٹ اور چرخہ اور اس طرح کی ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمدورفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا۔ "حضور وہ تیل تو سب ادھر اُدھربہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو یہ بھی مفید ہوتا ہے"۔
آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی اس پر بائیسکل خودبخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئی۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں۔ چاں۔ چوں کی قسم آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ، کھڑکھڑ۔کھڑڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھی۔ چر۔ چرخ۔ چر۔چرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑچڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہوجاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ دھنے سے بائیں اور بائیں سے دھنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کرنے کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہورہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔
اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اُٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر تھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ۔۔۔ کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی تو فضاء میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے۔ بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر اُدھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے سینوں سے لگا لیا۔ کھڑکھڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی رہی تھی لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ، چچوں پھٹ، کی صورت اختیار کرلی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔
اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جاتو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو

مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری تھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمردہری ہو کر بامر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹھیکیلوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہوجانا ازحد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کرلوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر بامر آگیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا، گدی کو اونچا کیا، کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہوگیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہوگیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہوگئی اور میں منہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ "دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے"۔ گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔

میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہوجاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرا ہاتھ اور میرا جسم دونوں ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کہ گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہوجاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کرلی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔ بائیسکل کی کھڑکھڑ سے دوکان میں جتنے لوگ کام کر رہے تھے، سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کرکے کہا۔"ذرا اس کی مرمت کردیجئے"۔ ایک

مستری آگے بڑھا لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بےدردی سے ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا"؟
میں نے کہا۔ "بڑے گستاخ ہو تم دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کرکے فوراً ٹھیک کرو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"
مستری نے کہا۔ "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کردوں؟"
میں نے کہا۔ "ہاں، وہ بھی ٹھیک کردو"۔
کہنے لگا۔ " اگر آپ باقی چیزیں بھی ٹھیک کرالیں تو اچھا ہو"۔
میں نے کہا۔ "اچھا کردو"۔
بولا۔ "یوں تھوڑا ہوسکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"
"اور پیسے کتنے لو گے؟"
کہنے لگا۔ "بس چالیس روپے لگیں گے"۔
میں نے کہا۔ "بس جی جو کام تم سے کہا ہے کردو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"
تھوڑی دیر بعد ہینڈل اور گدی پھر اونچی کرکے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"
میں نے کہا۔ "بدتمیز کہیں کا،تو دو آنے پیسے مفت میں لے لیے؟"
بولا۔ "جناب آپ کو بائیسکل بھی مفت میں ملی ہوگی، یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطاء معاف ہونے میں نہیں آتی۔"
میں نے کہا۔ "واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔"
مستری نے کہا۔ "ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔"
میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں نے بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کو چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لیے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہورہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار

کوشش کرکے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہوجاتا اور جنون کی حالت میں پہلے حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوئی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقدکرتا جس میں مرزا کی مکاری، بےایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کی ناپاک فطرت سے آگاہ کردیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مرجاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہوسکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں میں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپیہ کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ یہ "بائیسکل" ہے۔

دکاندار کہنے لگا۔ "پھر؟"

میں نے کہا۔ "لو گے"۔

کہنے لگا۔ "کیا مطلب؟"

میں نے کہا۔ "بیچتے ہیں ہم۔"

دکاندار نے مجھے ایسے نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا، پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کرسکتا آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے؟ آخرکار بولا۔ "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا۔ "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا۔"

کہنے لگا۔ "اچھا چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا۔ "پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟"

دکاندار بولا۔ "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہوں۔ اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا، آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔

"تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے

لیے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"
کہنے لگا۔ "تو کیا لیں گے آپ؟"
میں نے کہا۔ "تم ہی بتاؤ۔"
کہنے لگا۔ "سچ مچ بتاؤں؟"
میں نے کہا۔ "اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟"
کہنے لگا۔ "تین روپے دوں گا اس کے۔"
میرا خون کھول اٹھا اور میرے ماتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا۔
"او صنعت وحرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان، مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں لیکن تونے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بےزبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کرسکتا۔"یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہوگیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔
مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آلگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور ادھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا میں زمین پر اس بےتکلفی سے بیٹھا ہوں، گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے جس میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت وشنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جاپہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا جو پہیہ الگ ہوگیا تھا اس کو ایک ماتھ میں اٹھایا دوسرے ماتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ حاشادکلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔
جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو، کہاں جارہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ یہ دو پہیے کاہے کو لے جارہے ہو؟
سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں، انہیں ہنسنے دو، اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا۔ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی۔ "بس حضرت غصہ تھوک ڈالیئے۔" ایک دوسرے صاحب بولے۔ "بےحیا بائیسکل گھر پہنچ کے تجھے مزا چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جارہے تھے۔ میری طرف اشارا کرکے کہنے لگے۔ "دیکھا بیٹا یہ سرکس کی بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔"
لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے کشمکش میں پیچ وتاب کھا رہا تھا اب بہت ہلکا ہوگیا تھا۔ میں چلتا گیا چلتا گیا حتٰی کہ دریا پر جاپہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہوکر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کرکے اس بےپروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے۔ اور واپس شہر کو روانہ ہوگیا۔
سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازا کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے۔ "اندر آجاؤ"۔
میں نے کہا۔ آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر وضو کیے بغیر کیسے داخل ہوسکتا ہوں۔"
باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا:
"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے میں اب سے بےنیاز ہوچکا ہوں۔"
گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف۔اے میں پڑھی تھی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزرچکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجودکو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی اب ضرورت نہیں کہ کُرے کو دائیں سے بائیں گھمائیے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیئے۔ جہاں یہ نام کُرے پر مرقوم ہو، وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں

محل وقوع

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے، وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہےکہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے، اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔ لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یو۔پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں، اور اس میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔

حدود اربعہ

کہتے ہیں، کسی زمانے میں لاہور کا حدوداربعہ بھی ہوا کرتا تھا، لیکن طلباء کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اس کو منسوخ کردیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقعہ ہے۔ اور روزبروز واقع تر ہورہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے، کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا۔ جس کادارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے، جس کے

ہر حصے پر ورم نمودار ہورہا ہے، لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے۔ جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا

لاہور کی آب وہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں، جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں، حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے، میونسپلٹی بڑی بحث وتمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں۔ بلکہ ہمدردانہ غوروخوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی، اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں، بلکہ جہاں تک ہوسکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کے بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے پیدا کرنے کے لیے مرکز کھول دیئے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے، کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیرغور ہے۔ یہ اسکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہےلیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنےہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہوچکے ہیں اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت دقت پیش آرہی ہے اس لیے ممکن ہے تحقیق وتدقیق میں چند سال اور لگ جائیں، عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کرکے جابجا نل

لگوا دیئے ہیں۔ فی الحال ان میں مائیڈروجن اور آکیسجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے، کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کو دل شکنی نہ ہو، شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کو یہاں کے ذرائع آمدورفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کرلینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہ اثرپذیر ہوسکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیرشاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بےحد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردوبدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں اُلٹتے ہیں۔ اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو مک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دوکانوں پر ان ہی کا گوشت بکتا ہے۔ اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں انکے بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل وصورت میں دم دار تارے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے، حرکت کرتے وقت اپنی دم کو دبا لیتا ہے۔ اور اس ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے۔ تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہوسکے۔

قابل دید مقامات

لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دہری بنائی جاتی ہیں۔ پکے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کردیا جاتا ہے، جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیرمعروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "اہل لاہور کو مژدہ" "اچھا اور سستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے، جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً "گریجویٹ درزی ہاؤس" یا "اسٹوڈنٹس کے لیے نادر موقع"، یا "کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا۔" رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائریکٹری کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ درج ہے۔ بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اُس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالت بالوضاحت بیان کردیئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کی فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کوبہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض اشتہاری کلمات پختہ سیامی سے خود دیوار پر نقش کردیئے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہوگئی ہے، ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹتے وقت تک وہاں امالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہےکہ جہاں بحروف جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی بھاپ کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے، وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی تاج کا مکان ہے۔ "کرشنا بیوٹی کریم" شالامار باغ کو، اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت

اشتماروں کے علاوہ لاہور کی سب سےبڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں چونکہ انجمنوں کے اغراض ومقاصد مختلف ہیں اس لیے بسااوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظروسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آسکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلباء ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے۔ اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلباء کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں، قسم اولی جمالی کہلاتی ہے، یہ طلباء عام طور پرپہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گردونواح میں:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں، لیکن سب کی تصاویر ایک البم میں جمع کرکے اپنےپاس رکھ چھوڑتے ہیں، اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلباء کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا

ہے، اس لیے ہندوستان کا تخت وتاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جودوسخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوارک انہیں راس نہیں آتی اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلباء کی ہے۔ یہ اکثر روپ اور اخلاق اور اواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلہٗ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریئے پیش کرتے رہتے ہیں، صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے علی الصبح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں، اور شام کو ماسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں، گاتے ضرور ہیں، لیکن اکثر بےسرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلباء کی ہے۔ یہ طلباء کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچتے ہیں۔ ، اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے اورتعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلباء کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے، لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کےلیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کرسکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کئے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات

لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کے لیے سزا بھی تجویز کرو۔
میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔
* * *

تخلیقات
پطرس

تخلیقات پطرس

منظومات

١	نقش گم گشتگی	۵	میکدےمیں
٢	غزل	۶	دو شعر
٣	فرمودہٗ پطرس	٧	دھلی کی سیر
۴	دوراھہ		

مزاحیہ مضامین

١	اخبار میں ضرورت ہے	٣	بچے
٢	دوست کے نام	۴	اب اور تب

تنقیدی مضامین

۱	ہمارے زمانے کا اردو ادیب	۴	ہیروئن
۲	سر محمد اقبال	۵	ہیبتناک افسانے
۳	کچھ عظمت چغتائی کے بارے میں		

بچوں اور عورتوں کے لئے

۱	رونا رُلانا	۴	بچے کا پہلا سال
۲	کاغذی روپیہ	۵	دیہات میں بوائے اسکاؤٹ
۳	نوع انسانی کی کمانی		

نقش گم گشتگی

شدی تا باعثِ آرام جاں آرام گم شد
حدیث نام تو تا برزباں آمد زباں گم شد

مپرس از جستجو و نار سائی ہائے منجنونے
چو آوازِ جرس ہر سُو دیدو ہر زباں گمُ شد

نشانِ سجدہ ہائے ام اہل نظر را آں آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوق من آں آستاں گمُ شد

مرا جز خامشی محرم نبود د وائے ناکامی
بہ اظہار سخن چوں لب کشو دم راز داں گم شد

مگر آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را
کہ از گمرامیٔ خود ہم زراہ گمرہاں گم شد

مخزن. نومبر، دسمبر ۱۹۲۱ء

* * *

غزل

ہم آں داغے کہ بردل از تو دارم حرز جانم شد
ہم آں چشمے کہ نامندش سخنگو راز دارم شد

دلے بود و در آغوشم نگجنید و جہانم شد
خیالے داشتم از سرگزشت و آسمانم شد

بپرس اے داورِ محشر۔ چہ مے پرسی چہ می مپرسی
نگاہ حسرت آلایم کہ مے بینی بیانم شد

بگہ دزدیدہ افگندی بدل چوں راز جاں دارم
نظر کردی بہ بیباکی و فصل داستانم شد

دگرقدح جنوں در دہ کہ ہم در منزل اوّل

خیالِ و حشتم و امندو گردِ کار و انم شد

مزار داستان. ستمبر ۱۹۲۲ء

فرمُودہ ٔ پطرس

اے حسن تو زیاد تماشہ کنم ترا
عمرم دراز بادِ تمنا کنم ترا
برھم نظر مکن منِ ناکردہ کار را
گر التجائے بوسہ ٔ بے جاکنم ترا

بہ تبسّم چہ تسلّی بہ نگا ہے چہ قرار
▪ لشکر آرزوئے از لبم انگیختہ
برسر خاکِ من تشنہ لبے ریختہ باد
▪ قطرہ ٔ مے کہ تو از لغزشِ پا ریختہ

(کاروان)

• * *

دوراھہ

یہ میں نے کھہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترامی در میری آوارگی کا محور ہے

تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زھرِ احمر ہے

تجھی کو میں نے دیا اختیار گریے پر
یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے

ترامی حسم چمن ہے ترامی جسم بھار
تری می زلف سے ھر آرزو معطّر ہے

ترامی حسن ہےے فطرت کا آخری شامکار

کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لزرش خفی بھی ہے

تو میرے دعوئے الفت کی آن پر مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے

وفا کی طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے

تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے

مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے

مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے

شب وصال کی اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے

مجھے تو آکے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبح زیست بھی ہے۔ موت کی گھڑی بھی ہے

(کاروان)

• * *

میکدے میں

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں دل کی بات کریں
میں خُم کے سائے میں سرگوشیاں کروں ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں
جو بے ثبات ہے دنیا تو بے ثبات سہی
فریبِ مے سے اسے اور بے ثبات کریں
اگر منارہ ٔ کسریٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

(سویرا)
* * *

دوشعر

اٹھ گیا اپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کر ملے گا اگلی جون
اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی چخ
یہ چمن یونہی رہے گا اور ...الخ

(یہ دو شعر پطرس نے شملہ سے (حکومت ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی کے ساتھ) رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے۔ جون کے ہر دو معنی کی رعایت بھی خوب ہے. لیکن الخ کا قافیہ یوں اور کون لاسکتا ہے.)

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا گیا
واں جو پہنچا تو دیکھا

که اس جا کے لڑکے ہیں ویسے مى ننّھے
اور اس جا کے گدّے ہیں ویسے مى لمبے
اور اس جاکى برفى ہے ویسى مى میٹھى
اور اس جا کى بلى ہے ویسى مى موٹى
اور اس جاکر چڑیل ہیں ویسى مى چھوٹى
اور اس جا کے چالیس ہیں بیس اور بیس

اس نے یه کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تکتا رہا
اور تکتا رہا اور حیراں ہوا

(پھول)

* * *

مزاحیہ مضامین

بار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہار بازوں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔
میں اشتہار دینے والا ایک روزنامہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں یہ نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا اس کے جواب میں کئی ایک امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا آنے کے ساتھ ہی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا، مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا۔ جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوئے تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چائے والے کا بل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے۔ جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً ہوا دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈر ہی کے شائع کرنا پڑا، چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔
امیدوار کے لئے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو، ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک

نوٹ لکھنے کو کہا تو بپھر کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر۔ نہیں ہوں۔
ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر۔ ہوں،
مترجم نہیں ہوں ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر
کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں، ہم
سے بحثنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے کہ آپ
کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان
اور ہمارے صرف ونحو دونوں ونحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں
گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں
بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب
ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں ایڈیٹر کا اسم مخفف اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو
ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے۔
یہ بھی واضح ہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں لہذا کوئی خاتون ملازمت کی
کوشش نہ فرمائیں پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے۔
اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہو لیکن
پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنے شاید جوانمرد سمجھیں اور اہل قلم کی
بجائے طرح طرح کے پہلوان نیشنل گارڈ والے اور مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا
رخ کریں پھر یہ بھی خیال آیا کہ آخر عورتیں آئیں گی مردوں کی ایسی بھی کیا
قلت ہے لیکن ایک دن ایک خاتون آ ہی گئیں۔ پرزے پر نام لکھ کر بھیجا ہمیں
معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو بلاتے ہی کیوں؟ لیکن آج کل کم بخت نام سے تو پتہ
ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ زبیدہ، عائشہ کچھ ایسا نام ہوتا تو میں غسل خانے کے
راستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو نازجھانجھردی یا عندلیب گلستانی یا کچھ
ایسا فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ انہم بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں غلام
رسول، احمد دین، مولا داد ایسے لوگ تو ناپید ہی ہوگئے ہیں جسے دیکھئے
نظامی کنجوی اور سعیدی شیرازی بنا پھرتا ہے۔ اب تو اس پر بھی شبہ ہونے
لگا کہ حرارت عزیزی،نزلہ کھانسی، ثعلب مصری، ادیبوں ہی کے نام نہ ہوں
عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہرحال ہم نے اندر بلایا تو دیکھا کہ
عورت ہے دیکھا کہ یہ معنی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسن ظن سے کام لے
کر اندازہ لگایا کہ اس کے اندر عورت ہے ہم نے بصد ادب واحترام کہا کہ ہم
خواتین کو ملازم نہیں رکھتے انہوں نے وجہ پوچھی ہم نے کہا پیچیدگیاں، کہنے
لگیں آگے بولئے ہم نے کہا پید اہوتی ہیں۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت
کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں
ذکر نہیں اس لئے ہم تائید تردید کچھ نہ کر سکے۔ میری ولادت کو انہوں نے اپنا
تکیہ کلام بنا لیا، بہتیرا سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہوگیا اور بہرحال میری ولادت
کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے

پروپرائٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ نظریئے بیان کریں گے کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں گی۔ خدا خدا کرکے پیچھا چھوٹا۔
ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدم ہے وہ شہر کے ایک معزز ڈپو ہولڈر ہیں اخبار انہوں نے محض خدمتِ خلق اور رفاہ عام کے لئے جاری کیا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے چنانچہ ان کے پوتے کا ختنہ، ان کے ماموں کا انتقال ان کے صاحبزادے کی میٹریکولیشن میں حیرت انگیز کامیاب (حیرت انگیز اس معنوں میں کہ پہلے ہی ریلے میں پاس ہوگئے)ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر۔ کا فرض ہوگا نیز ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خوردونوش کا انتظام بھی ہو ہمارے پروپرائٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں بھی شامل ہوں گے اور اس پر کسی سب ایڈیٹر کو لب فقرے کسنے کی اجازت نہ ہوگی ہر بچے بہت ہی ہونہار ہیں اور حالات میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوئی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دوانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود سردار ابراہیم اسے گود میں لئے لئے پھرتے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔
ہمارے اخبار کا نام ''آسمان'' ہے پیشانی پر یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان بادل کا پہلے خرقہ دیرینہ ہے اس فقرے کو ہٹا کر کوئی سب ایڈیٹر کوشش نہ فرمائیں کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرع میں بھی آسمان آتا ہے ہم نے کہا بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے کہنے لگے علامہ اقبال کا مصرعہ ہے۔ اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے اس پر ہم چپ ہوگئے پیشانی پر اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار لکھا ہے۔ میرا تجویز کیا ہوا ہے اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ ضرور لکھا۔
بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم عربوں کے حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریزیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر ہم پالیسی میں جمود کے قائل ہیں اسی لئے سب ایڈیٹر کو مسلسل ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری

پالیسی یہ ہے کہ پنڈی گھیپ کے ہیڈ ماسٹرکو موسم سرما سے پہلے پہل یا ترقی دلوائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کرایا جائے (ان کے لڑکے کی شادی ہمارے پروپرائٹر۔ کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال رہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے).

انشا کے متعلق ہمارا خاص طرز عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں معرض وجود میں آیا ہے، ہوائی جہاز اڑتا نہیں محو پرواز ہوتا ہے. مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کی کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے۔ حالانکہ انہیں کہنا چاہئے تھے کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے مطلک طور پر مجروح ہوئے.

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کی ایک ٹکیہ لٹکانی ضروری ہے جس پر کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں بلاّ ہونا چاہئے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہر گز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے.

سینما کے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاغرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے، فی الحال یہ پروپرائٹر اور ان کے اہل خانہ کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا، علی ہذا جو اشیاء ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا.

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شحض بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا ہمارے پروپرائٹر آگے ہی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اسٹاف بہت بڑھ رہا ہے بہت بڑھ رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو بات باہر نکل جاتی ہے۔ یہ معلوم کبھی نہیں ہو اکہ بات؟ کون سی بات؟ اپنے ڈپو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے.

* * *

دوست کے نام

از لاہور

!اے میرے کراچی کے دوست

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنون لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی۔ واضح طور پر معلوم نہ ہوسکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہل جنون ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بےانتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق صحیح رکھتے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کرلیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا شغف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور یک گونہ تقویت قلب نصیب ہوگی ورنہ تن تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز ونیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوق سلیم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے۔ انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہوجاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ:

"مقدور ہو تو ساتھ رکھوں رازداں کو میں"

لیکن اے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روما اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی "ستوں چشم بددور میں آپ دیں کے" نے مسجد میں وعظ کرتے ہوئے آپ کے لہوولعب اور تفریح کو شی پر نفرین نہیں کہی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتویٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی گھاگس مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

ببانگ چنگ مخمورمے کہ مستحب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا ضیافت کے موقع پر کسی نیم تعلیم یافتہ معصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعوے دار ہے آپ کی آزاد منشی کا مضحکہ اُڑایا؟ اور جب آپ پٹے ہوئے نظر آئے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش نہیں آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر بیزاری اور بددلی پک رہی ہوگی اور آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہوگی ورنہ جس حسنِ مذاق پر آپ کو غرّہ ہے وہ تو آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرف بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سربز انو دبکا بیٹھا ہے اور بام پڑا پڑ مینہ برس رہا ہے. اور آندھیاں چل رہی ہیں.
پچھلے سال قائد اعظم یہاں تشریف لائے۔ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ ''روزگارڈن'' کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا ''روزگارڈن'' کا نام ''گلستان فاطمہ'' رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کریہہ اورطفلانہ تھی کہ مدرسہ کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لٹکاتے ہوئے شرم آتی۔ ''گلستان فاطمہ'' کی بےذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت نہ وہ غریب می اس نام سے مانوس ہوں گے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سایے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سوجاتے ہیں۔ نہ وہ پتلون پوش می اس میں کوئی کشش پائیں گے جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں۔ لیکن جب ان جلوے کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے، کیونکہ ایسے شان دار موقع کے لئے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی.
مسلمان کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتب قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہوگا۔ پنجاب کا خطہ، وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجو ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوش نویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے قلمذتہہ کرتے تھے اور اس پر یہ حال کہ اس تقریب سعید پر اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بےڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہہ میں بد مذاقی کا عروج نظر آتا۔ اور آپ پژمردہ ہوجاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں۔ اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفا شعاری پر حرف

آتا .
اب آپ اس انجمن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیوں کر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباو اجداد خط اور دائرے اور خم اور زاویے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوئی اور طغرے، نستعلیق اور نسخ، کس کس نہج سے انہوں نے ابجد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے مطلا اور مذہب نسخوں کو دیکھو ، ان کے روضوں اور محلوں، ان کی مسجدوں اور خانقاہوں، ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو .
مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سطوت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین وجمیل حروف کے لافانی نقوش چوب وقرطاس وسنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے کلچر کے احیا اور تحفظ کے لئے سب قوتیں تمہارے ہاتھ دے دی ہیں قسمیں کھا لو کہ اس ورثہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کرلو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابجد کے خط کھینچیں گے، اسلاف کا نام روشن کریں گے . اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے، اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے۔ یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہیں ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے۔اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی لیکن کیا آگے بھی بڑھئے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی کیجئے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کررہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اے دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہئے گا۔ کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بےانتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں.
ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے صحیح معنوں میں آرٹ اسکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹکی

چٹکی بھر پھینک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کردیا گیا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک یورپین خاتون میسر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں وہ کہیں ادھر اُدھر ہوگئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہوجائے گا کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدانخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آجائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی توتہ کرکے رکھ دی گئی ہے کیونکہ ہو تو بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویرکشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہلوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جان داروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑوں، دریاؤں، جنگل پر کی جائے. اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی. شریعت کا قدم درمیان میں آیا. ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں، فوٹو البتہ جائز ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کرجاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹو گرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جواب ملا کہ چابکدستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرض یہ کہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق وراستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کھینچتا ہے۔ یہ حال تو جان دار اشیاء کا ہے باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کوتوال حق بین مصوروں کے ''جھوٹ'' کو گردن سے جا دبوچے گا. اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیں گے کہ یہ وین گوگ ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی.

ان حالات میں چغتائی کے جینے کا امکان بہت کم ہے۔ کوئی بات ''سچ'' بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ درخت تک تو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال، چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے، ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تکمہ یا ڈوری لیلیٰ کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے سازوسامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کر یہی ایک ہمارا مصور ہے اسے دفن کر دیا تو یہ وبا فوراً تھم جائے گی. اور

ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہوجائے گی۔ باقی رہی مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوروں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ کراچی کون سا ایسا جزیرہ ہے او رکون سے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ اردگرد کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے لٹھ چھین کر اس کی جگہ قلم اور موقلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ہیجان پیدا کیجئے۔ آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کرلیتا ہے۔ لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر لڑتے ہیں سب سے پہلے اسی چیز کا خون کرلیتے ہیں۔ آپ کہئے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی دعوت دیجئے تو تلاشی شروع ہوجاتی ہے کہ کس کے درّے لگائیں؟ کسے سنگسار کریں؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سر بازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں اور بچیوں پر اپنا بہیمانہ زور آزماتے ہیں:

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی؟

ایسے غیظ وغضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے؟ آرٹ کے لئے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فروغ لازم ہیں یا پ ھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے ک ھول دے اور ان میں سے شعر وسخن، نغمہ ورنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے میں بھی پنپتا ہے؟ کہ ہر بڑے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہے اور ہر چھوٹا اپنی بےبضاعتی کا بدلہ ہر ہمسائے اور راہگیر سے لینے پر تُلا ہو، نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پاکر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا وسزا کی امید یا خوف ہو نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا شکار معتکف ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لئے تصویریں بناتا رہے۔ نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اسے بک لینے دیں. فنون

لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے. چند مصوروں پر اوباشی اور بےدینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دیئے جائیں جو ان کے ہنر کو کھردری سے کھردری کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوٰی تھا اس کا دور اب گزر گیا:

میں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے، اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے۔ آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار ہی کی تصویر پر اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب، چھوٹے، بڑے، ادنٰی، اعلٰی سب پر اپنی بخششیں ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت وحرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا. آپ تو اس عہدِ زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے۔ تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں، کسانوں کے تہمد میں، سیلانی کے ہاتھ کی چھڑی میں، پنہاری کے مٹی کے گھڑوں میں، غرض زندگی کے ہر گوشے میں نورپاش ہو لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں ٹمٹما رہی ہیں انہیں ہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لئے انہیں سب یگانۂ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے.

فرحتے نیست کہ در پہلوئے آں صد غم نیست
روز مولود جماں کم زشب ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے میرے دوست ہم کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی تو پھر اے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں. کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخلاص اور اصابت رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہوگی، بڑے بڑے ارباب حل وعقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہئے کہ:

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

(نقوش جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

* * *

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہوجائے اور صحت یا بی کی کوئی

امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی کے سرہانے میز پر جو انگور کا خوشا رکھا ہے اس کے چند دانے کھا لئے، مہینے دو مہینے کے بعد کوٹھے پر غسل کر لیا یا گاہے گاہے ناخن ترشوا لئے۔
مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ شباب کا رنگین زمانہ امتحانوں میں جوابات لکھتے لکھتے گزر گیا۔ اور اب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گزر جائیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا۔ یقین تھا کہ اس کے بعد یا مرض نہ رہے گا یا ہم نہ رہیں گے۔ سو مرض تو بدستور باقی ہے اور ہم...ہر چند کہیں کہ ہیں... نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بےفکری کا زمانہ تھا۔ نرم نرم گدیلوں پر گزرا ،گویا بستر عیش پر دراز تھا۔ اب تو صاحبِ فراش ہوں۔ اب عیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ انگور کھا لیا۔ غسل کرلیا۔ ناخن ترشوا لئے۔
تمام تگ ودو لائبریری کے ایک کمرے اور اسٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے عین درمیان کا ہر موڑ ایک کمین گاہ معلوم ہوتا ہے۔ کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصبح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا اب اس کے ایڈیٹر۔ صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں سلام روستائی کھینچ ماریں گے۔ مال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ حال ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر۔ چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا ہوں کہ یہ ”دمن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ“ والا معاملہ ہے۔ اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پر طاری ہوجاتا ہے۔ جانتا ہوں کہ کرسی ِ صدارت کی سولی پر چڑھنا ہوگا اور سولی بھی ایسی کہ انا الحق کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔
قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر بٹھا دیا اور میری

ہر حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرےاردگرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کنچن چنگا کی طرح اپنی بلندی پر جما بیٹھا تھا۔جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی مجھ پر اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تمد پوش، تولیہ بردار، صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک بجے تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ گئے چوس چوس کر جا بجا پھوگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آثار صنا دید کا سا مٹیالہ رنگ اختیار کرلیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کرسی اور اسٹول میسر آگیا وہیں کھانا منگوا لے گا اور کھانا کھا چکنے پر کوؤں اور چیلوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا تاکہ دنیا میں نام برقرار رہے۔اب یہ حال ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اگر اس چھٹی کے دن بال نہ کٹوائے تو پھر بات گرمی تعطیلات پر جا پڑے گی۔ مرزا صاحب سے اپنی کتاب واپس نہ لایا تو وہ بلا تکلف ہضم کرجائیں گے۔ مچھلی کے شکار کو نہ گیا تو پھر عمر بھر زندہ مچھلی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

اب تو دلچسپی کے لئے صرف یہ باتیں رہ گئی ہیں کہ فورتھ ائیر کی حاضری لگانے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دروازے کے پاس جو نوجوان سیاہ ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور اس دروازے کے پاس جو نوجوان سفید پگڑی پہنے بیٹھے ہیں۔ حاضری ختم ہونے تک یہ دونوں جادو کی کرامات سے غائب ہوجائیں گے اور پھر ان میں سے ایک صاحب تو مال میں نمودار ہوں گے اور دوسرے بھگت کی دکان میں دودھ پیتے دکھائی دیں گے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی نظر بندی کا کھیل کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یا صاحبِ کمال کے کرتب کا تماشا کرتا ہوں جو عین لیکچر کے دوران میں کھانستا کھانستا یک لخت اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح دروازے تک چل کر وہاں سے پھر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر ہفتوں سراغ نہیں ملتا۔ یا ان اہل فن کی داد دیتا ہوں جو روزانہ دیر سے آتے ہیں اور یہ کہہ کر اپنی حاضری لگوا لیتے ہیں کہ صاحب غریب خانہ بہت دور ہے۔ جانتا ہوں کہ دولت خانہ ماسٹل کی پہلی منزل پر ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پر یقین انہیں بھلا کیسے آئے گا اور کبھی ایک دو منٹ کو فرصت نصیب ہو تو دل بہلانے کے لئے یہ سوال کافی ہے کہ مال کی گھڑی مینار کی گھڑی سے تین منٹ پیچھے ہے۔ دفتر کی گھڑی مال کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے۔ چپڑاسی نے صبح دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی مال کی گھڑی سے نو منٹ پہلے تو مرکب سود کے قاعدے سے حساب لگا کر بتاؤ کہ کس کا سر پھوڑا جائے۔

وہی میں نے کہا نا کہ انگور کھا لیا، غسل کرلیا، ناخن ترشوالئے۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور -- ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

پطرس
(راوی ۱۹۲۹ء)

* * *

تنقیدی مضامین

تحریر: مظفر علی سید

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ اجلاس منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے اردو ادب کے جدید دور یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص چبھتے ہوئے انداز میں اس پر رائے زنی کی تھی۔ اس مضمون کی اصل خوبی تو ان کی انگریزی انشاء پردازی ہے جس کا اردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کرتے۔ زیر نظر ترجمہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں، ان کے انداز نظر اور جدید اردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ خیال سے واقف ہوجائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دو گونہ تھا۔ نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے، اس لئے اس مقالے کی ''معروضیت'' اور ''بےلاگ مطالعہ''شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پہ چڑھ کے دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ دو ایک عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور اُن پر ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔ ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک ٹکڑے اس میں ملاحظہ سے اچھے ہیں۔ گیارہ سال پہلے، جب اقبال اپنے اسلاف سے عالم بالا میں جا کر ملے تو دور ونزدیک کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکھٹے ہوئے۔ غالب اور میر، حالی،شبلی اور گرامی، حتیٰ کہ نظیری، رومی اور حافظ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گومگو کی حالت میں بھی گزرے۔ مثلاً جب خودی کے مسئلے پر ایک عالمانہ بحث رومی اور اقبال کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے اور ''تقدیر اُمم'' پر اقبال کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالب کے خراٹے بھی سنائی دیئے۔ مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بےحد ساز گار رہی۔ جانے پہچانے اقتباسات،

کتابوں سے یا حافظے سے بآواز بلند پڑھے گئے اور شب وروز کی ہمزماں لہروں پر حکمت اور ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا۔ بہت سے قضیے سامنے آئے اور ان میں سے کئی ایک حل نہ ہوسکے اس کے باوجود فہم وبصیرت کے تازہ اور فرح بخش نقش ونگار دریافت ہوئے۔ اقبال قدماء میں سے نہ تھے پھر بھی قدماء کے لئے اجنبی نہ تھے بس ذرا نئے نئے اور بھرپور سے لگتے تھے۔

آج کا نوجوان اُردو ادیب، اگر اس کو اس سفر پہ وقت سے پہلے روانہ ہونا پڑے، اس محفل میں کیسا لگے گا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کا استقبال مروت اور شفقت سے کیا جائے گا مگر یہ خوف بھی ہے کہ وہ ذرا کھویا کھویا سا لگے گا۔ قدماء سے اظہار خیال اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ نیا مسافر، اپنے اور اپنے پیشروؤں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل پائے گا جسے پاٹنے کے لئے اس کو کتب خانہ فردوس میں طویل نشستوں کا پروگرام بنانا پڑے گا۔ وہ حالات کی مجبوری سے اپنے اجداد کا جائز ورثہ وصول نہ کرسکا۔ الا ماشاء اللہ۔ راشد اور فیض، فراق اور فرحت اللہ بیگ، جوش اور حفیظ، ماضی کے ساتھ ان سب کے مراسم اچھے ہیں اگرچہ انہوں نے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ، اپنے آپ کو حال یا مستقبل کے ساتھ وابستہ کررکھا ہے۔ مگر وہ پیہمکھوتی ہوئی اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں اور سلف کی ایسی یادگار ہیں جو نجانے پھر کب پیدا ہو۔ ہمارے لکھنے والوں کی اکثریت اپنے آپ روایت سے دور ہوتی جارہی ہے۔ مولوی نذیر احمد جو آج سے پچاس برس پہلے کے ناول نگار تھے، انبیاء کے اقوال کو احترام کے ساتھ اور شعراء کے اقوال کو کرامت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ ان کا ویلن انبیاء کو کرامت اور شعراء کو لذت کے ساتھ نقل کرتا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ مصنف اور اس کے کردار دونوں میں حوالہ دینے کی اہلیت تھی۔ دونوں نے ادب کی ایک مشترک دولت ورثے میں پائی تھی جو اس دور کے ذہنوں میں صاف ترتیب کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے اردو ناول نگار میں اور اس کے ہیرو میں کوئی بات مشترک ہے تو یہ ہے کہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کرسکتے۔ یہ نہیں کہ وہ پڑھتا نہیں۔ وہ بلا نوش قسم کا قاری ہے مگر ولایتی ناشروں کی چھاپی ہوئی ''بہار کی فہرستیں، خزاں کی فہرستیں'' اور ''سمندر پار کے ایڈیشن'' کچھ ایسے تسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ نہ چننے اور چھاپنے کی فرصت رہ جاتی ہے، نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی۔ ہمارے دور کا نصاب بھی الجھا ہوا ہے اور پیچھےمڑ کر دیکھنے کی تو تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے کے اردو ادیب کا مستقبل ہو تو ہو، ماضی کوئی نہیں۔

اس قطع تعلق کی وجوہات گوناگوں اور پیچیدہ ہیں۔ اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب نے جس نظام تعلیم کے تحت نشوونما پائی ہے۔ یہ سب اسی کا قصور ہے۔ رسمی تعلیم پچھلے پچاس ایک سال میں، شرافت اور

(یا تقدس کے اس قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور) یا اس دنیا کے لئے انبیاء وشعراء کی مناسب مقدار کی مدد سے تیار کرتا تھا۔ پرانے مسلمات غائب ہوچکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیاء وشعراء بھی۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم نے سرانجام دیا ہے۔ باقی اس عرصے میں، ہماری تعلیم ایک نئے تصور کی تلاش میں جو پرانے تصور کی جگہ لے سکے) تجربوں یا ٹامک ٹوئیوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ ٹامک ٹوئیاں اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں۔ بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ دنیا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور لکھنے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے۔ اس نصف صدی میں بہت سے بند اور پشتے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو معاشرے کو بقا اور استحکام بخشتی تھیں، اسی وقت تک کار آمد تھیں جب تک معاشرے کا ناک نقشہ درست تھا۔ ناک نقشہ پھیل پھیل کر یوں متزلزل ہوگیا ہے جیسے پانی کی سطح پر تیل کے لہریے۔ قدیم معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ قدیم معاشرہ باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہوچکی ہے کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لئے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے۔ رسم ورواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف، وہ قدیم انبیاء اور شعراء دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اس چیز سے جو اسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح سی ہوجاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہوجاتے ہیں مگر خیر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے۔ اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کرکے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جنبش قلم الفاظ وتلمیحات اور حکایات وعلائم کے ذخیرے سے، جو فن کار مصنف کو نازک اور کار آمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہوگیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں او رلکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعدپھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی وارداتیں اور نفسیاتی مشاہدات مضمر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسانی تجربے کی طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے۔ اگر طیف کا ایک خط گم ہوجائے تو ہم اس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے۔ اُسی پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے

ہیں۔ اسے ان چیزوں کو جو پہلے معلوم ومحسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اس نے اپنی تخلیقی شخصیت پہ ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دو چند ہوگئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گومگو میں گرفتار اور ہزاروں معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ لفظ جن سے اس نے پہلو تہی برتی تھی۔ اب اس سے پہلو چراتے ہیں۔ (سر) ڈینی سن روس نے، جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر وتقدیر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا۔ ادبی حوالوں کے زیرعنوان انہوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شکسپیئر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور ''انگریزی روایت'' کے تحت قومی تہوار معروف شخصیتوں کے القاب وخطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے حتٰی کہ ایک جُز ''گھسے پٹے جملوں'' پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے، اسی انداز سے، اردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہوسکتا تھا! اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی ایک مشکل درپیش نہیں۔ وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خوبی کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ علماء اور ماہرین تعلیم، تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کرکے ارشادکریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے۔ بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ ہر بیرونی زبان دوگونہ رحمت ہے، اس ملک کے لئے جس کی وہ زبان ہے۔ اور اس کے لئے بھی جس نے اُسے اختیار کیا۔ان کا ارشاد بجا ہے کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں کی اکثریت کے لئے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا، کچھ کام بھی کرنا ہے۔ اظہار خیالاس کا فرض ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے ذریعے۔ چاہے کتنی زبانوں سے اس نے ذہنی غذا حاصل کی ہو۔ ذہن تو اس کے پاس ایک ہی ہے۔ ایک دریچہ سبز ہے تو دوسرا سرخ مگر ذہن میں یہ دونوں رنگ آرام سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ وہ آپس میں گھل مل کر ایک تیسرے رنگ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں جو ایک دریچے کے پاس ذرا زیادہ سبز ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ۔ مگر نہ تو کہیں پوری طرح سبز ہے اور نہ پوری طرح سرخ۔ یہ لطیف او رپراسرار روشنی اس کے لئے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے اور باعث فخر بھی۔ مگر اس ملی جلی روشنی کو سبز یا سرخ فلٹر

میں سے اپنےاصلی رنگ میں گزارنا کتنا مشکل ہوگا۔ ایک لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات آپ سے نہیں کہہ سکتا۔ جب تک کہ دونوں زبانیں استعمال نہ کرے۔ مگر اس صورت میں بھی ایک دقّت ہے۔ اس کا ذہن کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ذہن کی دو لہریں یکے بعد دیگرے پیہم ابھرتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہے۔ اگر اس کو ایک زبان کا پابند کر دیا جائے او رپوری بات کہنے کی مجبوری بھی ہو تو نیم واضح اور بے ربط و مہمل قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔ اس کی تحریر کی بُنت میں آپ کو عجیب قسم کے خم وپیچ نظر آئیں گے۔ اور ابہام واشکال کی کئی صورتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر، انگریزی ساخت کے جملے بے ڈھنگی اردو میں ملبوس دکھائی دیں گے جن کو دونوں زبانوں کے ماہرین ہی سمجھ سکیں گے۔ زبان ایک نازک اور لطیف آلہٴ اظہار ہے جسے فن کار بڑی مہارت سے برتتا ہے مگر یہ دوغلی زبان معنی کے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی اور گونگے کے اشاروں سے زیادہ قابل فہم نہیں ہوتی۔ لفظ اپنے معنوں کو ساتھ لےکے نہیں چلتے بلکہ محض دور سے ان کی طرف اشارہ کرکے رہ جاتے ہیں جب احساسِ شکست قوی ہوجاتا ہے تو اردو کا ادیب اردو کو چھوڑ کر انگریزیمیں لکھنے لگ جاتا ہے مگر فلٹر سبز ہو یا سرخ، مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب اپنے آپ کو ایک نئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ معاشرہ اس کے فہم وبصیرت کی حدوں سے بڑھ کر وسیع او رپیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ اس کے اسلاف کے تجربے اور مشاہدے سے ماورا ہے۔ اور اسی وسیع وعریض حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنا ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو۔ جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی۔ وہ بڑے پُرجوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرز کی محفل بناکے بیٹھ جائے۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب ایک نہ ایک انجمن یا حلقے سے وابستہ ہوگئے ہیں اور ایک دوسرے کے تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے، محفلیں، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں، معاشرہ سازی کی جعلی اور مجنونانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور ادیب کو ان آوارگیوں اور سیاحتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کے ”کل“ کو پالے اور چونکہ برونِ خانہ سے اس کا ربط قائم نہیں ہوا ، اس کو درون خانہ میں تلاش وتجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے۔ زندگی کا

رس خشک ہوجاتا ہے۔
پی۔ ای۔ این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے
آرتھرکیسٹلر نے بتایا تھا کہ تورگنیف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ یہ گرم پانی کی بالٹی، کیسٹلر کے نزدیک الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت تھی او رکھلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی۔ جو فن کار کے لئے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیسٹلر نے یہ بھی کہا تھا کہ باہر کی دنیا ادیب کے دل میں ایک زبردست خواہش کو جنم دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کھڑکی بند کرکے بیٹھ جائے اور اپنے تخلیقی سرچشمے پر اکتفا کر لے مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہوسکتی ہے۔ باہر کی ہوا، دباؤ ڈالنے کی بجائے اس کو باہربھی کھینچ سکتی ہے تاکہ وہ گرم پانی سے اپنے پیر نکال کر کھڑکی پر جھک جائے۔
ہمارے اردو ادیب کو بازار کے واقعات سمجھنے یعنی مشاہدہ اور مرکزیت پیدا کرنے کی ضرورت کچھ اس شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اس کو اکثر وبیشتر کھڑکی پر جھکا دیکھ کر ہمیں حیرانی نہیں ہونی چاہئے۔ باہر منظر اس کے لئے اتنا دلفریب ہوتا ہے کہ وہ چیخنے چلانے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ وہ لکھنے کی میز پر واپس نہیں آتا اور اور گرم پانی پڑا پڑا ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا اُبھر آئی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بےشمار چیزیں ہیں اور چھانٹنے کے لئے بےپناہ مسالہ ہے۔ اس حالت میں اس سے عظیم فن پاروں کی توقع بےجا ہے اور یہ امید بھی عبث ہے کہ وہ اپنے پیر گرم پانی میں ڈالے رکھے گا اور گلیوں بازاروں کے ہجوم میں شامل نہیں ہوگا۔ آنے والے فنکار ساتھیوں کو اس کے یہاں مقصد کی سنجیدگی ملے گی۔اور آگے بڑھ کر دیکھنے اور مستقبل کو تلاش کرنے کی ہمت، چاہے اسلاف کی دعائیں اس کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں۔ اس کی تیز نظری، اضطراب، آگاہی اور بےجگری، نئی راہوں پر چلنے کا عزم اور کچھ کھونے پانے سے اس کی بےنیازی یادگار رہے گی۔ ہم اس سے بڑا خراج تحسین اس کو نہیں دے سکتے کہ اس کی مشکلات اور مجبوریوں، تکلیفوں اورتعزیروں کو سمجھیں تاکہ اس کی جدوجہد اور اس کے کارنامے کی بیش از پیش قدر کرسکیں۔ میں نے اس جگہ یہی کرنے کی کوشش کی ہے۔

* * *

سرمحمد اقبال

وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا"۔"
اقبال کی وفات سے ہندستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہوگیا۔ وہ بطور ایک عالم متجر اور تاریخ، فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم بھی ان لوگوں کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی اعلٰی شاعری تک رسائی سے قاصر تھے، منبع فیض وجود تھا۔ بطور شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا لیکن ادبی اور عمرانی دنیا میں اثر ونفوذ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلند تر تھا۔ اس کی وفات سے جہاں مسلمانوں سے ایک فصیح اللسان پیغامبر اور ان کی تہذیب کا ایک بہت بڑا شارح چھن گیا ہے وہاں اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی درازمدت کے لئے اہمیت اور منزلِ مقصود چھن گئی۔
کم وبیش چالیس سال گزرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری اگرچہ لوگوں میں مقبول تھی او رہرکس وناکس اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں بلکہ محض زندگی کے حاشیہ کی تزئین سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقبول عام فن تھا مگر یہ فن محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت شاعری کیا تھی؟ محض جذبات انگیز عیاشی، نرم ونازک، دل خوش کن، مزاحیہ یا مجویہ، لیکن سراسر بےربط۔ اسی لئے اس کے اختیار کرنے میں سنجیدگی او رمتانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔
لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا۔ اور لوگوں کی زبان پر تعمیرات ملت اور ترقی کے الفاظ آنے شروع ہوگئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے آرٹ کو پھر ڈھونڈ نکالا کہ یہ بھی انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلٰی سنجیدگی اور مقصد ومدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ حالی ایسا غزل گو عہدِ شباب کی ہوس کاریوں سے تائب ہوکر مشہور زمانہ مسدّس کا مصنف بن گیا۔ جس نے خوابِ غفلت کے متوالے ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کرسکی۔ ان ہی حالات میں اقبال جس نے اسی فرسودہ ڈگر پر اپنی شاعری شروع کی تھی، محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے احیا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بےقرار ہے۔
:ہندوستان ہمارا
اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس کے ولولۂ عمل سے بےتاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذباتِ محبت کا پتہ لگتا

:ہے اس کی نظم

''سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے''

اب تک فرقہ وارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ پُراثر اپیل ہے جو کسی محب وطن کے قلم سے نکلی ہو۔ اور اس کا شمرہ آفاق گیت ''ہندوستان ہمارا'' میرے خیال میں بہترین قومی گیت ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا اور جس سے بہتر گیت کی شاید مدت مدید تک بننے کی امید نہیں ہوسکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے غائر مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا۔ اس کے افق خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور ملک کی نسبت سے قوموں کا تصور اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور اپنی گفتگو میں وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں تقسیم کرنے کی بیہودگی ثابت کیا کرتا۔ وہ ایک ایسے تمدنی نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے اور جو زندگی کو ایک مقصود مدعا بخشے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا بامقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت العلل کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور بامقصدیت انہیں نظر آئی تو اسلام میں یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بےدریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

:حجازی خیالی دنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص غم ناک کیفیت موجود ہے۔ ہم میں شاید ہی کوئی فن کار ایسا ہو جس کے فن میں گھر کے لئے اداسی بطور مرض کے موجود ہو۔ ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزومند ہیں۔ اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی۔ ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بےپناہ دلکشی پیدا کردیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پُرشوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم واستقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بمنزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب اور اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہوچکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدر دان اس سے چھن گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک

نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو صرف اس لئے ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز نہ ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیئر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کی شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کولرج کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ''انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں'' اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

:فارسی اور اردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ تر حصہ فارسی میں ہے اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرار خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے، انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کی ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھی، خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا (اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا) اسی لئے اس کے یوپی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہتے۔ اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغ کا معنوی فرزند تھا۔ جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ ہوا ہے لیکن اس کی غیرمعمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا۔ اور اس کی طرز شاعری کے بےشمار پطو ملک کے طول وعرض میں پیدا ہوگئے۔ اگر افراد کی وسیع اثرات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو نئی اور مختار صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زور دار اور لچکیلی زبان سے مالامال کیا جس سے وہ پطے قطعاً ناواقف تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور شیرنی بخشی جس کا راز انھوں نے عربی زبان کے مطالعہ کرتے وقت پالیا تھا لیکن چٹپٹے مضامین یا پُراثر وعظوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے اور شاعر زبان پر زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جدید اردو کے بنانے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیش رو غالب) ابھی تک سب سے نمایاں اور زبردست اثر ڈال رہا ہے۔ ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادان فن نے گڑھے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ از صوفی ریاض حسین)

* * *

ہیبت ناک افسانے

ہیبت ناک افسانے'' کا پیکٹ جب یہاں پہنچا۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔'' میری عدم موجودگی میں چند انگریز احباب نے جو کتابوں اور اشیائے خوردنی کے معاملے میں ہر قسم کیبےتکلفی کو جائز سمجھتے ہیں، پیکٹ کھول لیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے۔ بجز چند ایسے کلموں کے جو غصے یا رنج کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں او رجو بار بار سننے کی وجہ سے انہیں یاد ہوگئے ہیں۔اردو تقریر میں ان کی قابلیت یہیں تک محدود ہے۔ تحریر میں اخبار ''انقلاب'' کا نام پہچان لیتے ہیں وہ بھی اگر خط طغر ' ی میں لکھا گیا ہو چنانچہ جب واپس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی اپنی رائے قائم کر رکھی تھی۔ سرورق پر جو کھوپڑی کی تصویر بنی ہوئی ہے اس ے ایک صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کتاب:

میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

سے متعلق ہے۔ ایشیا کے ادیب (عمر خیام، گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب سمجھے کہ فن جراحی کے متعلق کوئی تصنیف ہے۔ ایک بولے جادو کی کتاب معلوم ہوتی ہے (ہندوستان کے مداریوں کا یہ ہاں بڑا شعبدہ ہے) ایک خاتون نے کتاب کی سرخ رنگت دیکھ کر بالشویکی شبہات قائم کرلئے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ گو یہ سب کی سب کہانیاں میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں۔ اور ان میں سے اکثر تراجم کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دلفریبیاں جو مجھے کبھی کسی تصنیف کو مسلسل پڑھنے پر مجبور کرسکتی ہیں سب کی سب یہاں یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو تحریرمیں وہ سلاست اور روانیکہ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ او رپھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس سے ہندوستان یا انگلستان میں کبھی بھی مَفر نہ ہو۔ یہ کتاب تیرہ ہیبت ناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے مصنف کا مدعا یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے او رہر افسانے میں درد وکرب خوف ودہشت یا پھر مرگ وابتلاء کی ایسی خونیں تصویر کھینچی جائے کہ بدن پر ایک سنسنی سی طاری ہوجائے۔ ایڈگرایلن پو کے پڑھنے والے ایسے افسانوں سے بخوبی آشنا ہوں گے۔ حق تو یہ ہے کہ پو اس فن

کا استاد تھا۔ اور یہ جو آج کل اس صنف ادب کی کثرت فرانس میں نظرآتی ہے عجب نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ تو اسی کی بدولت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پو کا اثر مسلم ہے اور ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو۔ جہاں کسی نہ کسی صورت میں اس نے اپنا رنگ نہ پھیر رکھا ہو۔ پیرس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لئے وقف ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں۔ اس کمپنی نے اس قسم کے ڈراموں کا اچھا خاصا مجموعہ مہیا کر رکھا ہے۔ تھیٹر کی ڈیوڑی میں چیدہ چیدہ ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کہیں کوئی بدنصیب موت کی آخری انگڑائیاں لے رہا ہے۔ چہرہ تنا ہوا ہے اور آنکھیں باہر پھوٹی پڑتی ہیں۔ کہیں کوئی سفاک کسی حسینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے۔ بائیں ہاتھ سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں خون آلود چھریہےاورلڑکی کی آنکھوں سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ کھیل کو ہیبت ناک بنانے کے لئے جو جو تدابیر بھی ذہن میں آسکتی ہیں ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنی شکل شباہت اپنی آواز اور اپنی حرکات کے ذریعے ایک خوف سے کانپتی ہوئی فضا پیدا کرلیتے ہیں۔ پردہ اُٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی بلکہ چراغ گل کرکے لکڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے ہیبت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد وکرب یا خوف ودہشت کے مناظر یا افسانوں سے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کو درد کہا جاتا ہے۔ اس سے خوشی کیسے حاصل ہوگی۔ لیکن یہ ہمارے متدا دل الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ اصل خیال کو جو اس فقرے سے ظاہر کیا گیا ہے الفاظ کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرین نفسیات دکھ، درد، کرب وغیرہ اس قسم کے الفاظ استعمال سے مجتنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بہت سی ایسی کیفیات جن کو ہم عام زبان میں دکھ درد وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بسا اوقات اس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے وصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈ لیتے ہیں۔یقیناً آپ کے پڑوس میں کئی ایسی عورتیں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور واویلا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تمنا پوری کرلیں۔ جرائم اور اموات کی گھناؤنی سے گھناؤنی تفصیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کئی اخباروں کی مقبولیت کا باعث ہے۔ لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ یا میں بعض دہشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے متامل نہ ہوناچاہیئے کہ کہیں لوگ اس کو ہماری طینت کے کسی نقص پر محمول نہ

کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں رومن قوم کے مجوم اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے ماتحت دیکھنے آتے تھے۔ ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جاکر ختم ہوتی تھی۔ او رکشف وخون کا یہ نظارہ ہزاروں لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری تہذیب اس تجاوز کی متحمل نہیں۔ لیکن افسانوں اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کیمیا سے کشید کرکے لمحے بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھرتھراہٹ پیدا کرلیتے ہیں تو کم از کم میں تو کسی طرح بھی نادم نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹول لیجئے۔ اعصاب میں ایک تھرتھراہٹ! بس یہی ان افسانوں کا مقصد ہے اور جس کامیابی، جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد کی تکمیل چاہی ہے اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالعہ اہل قلم کو اس کے ترجمے کی خواہش ہو۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابل وقعت ضمانت نہیں پیش کی جاسکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی خود مترجم نے کتاب کے دیباچے میں واضح کر دی ہے۔

موسیولیول بے انتہا، سلیس عبارت استعمال کرتے ہیں۔ جس کی پختگی" اور روانی پڑھنے میں نظم کا سا لطف دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف چیزوں کے بیان میں تناسب کی سمجھ بےحد تیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل کہانی ایک نفیس اور صاف ستھرے "ترشےترشائے ہیرے کی طرح دل کش معلوم ہوتی ہے۔

یہ اختصار دہشت انگیز افسانوں کی ایک ضروری صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان میں وہ تندی وہ تیزی نہیں رہتی جس سے سنسنی پیدا کی جا سکے۔ او رپھر یہ اختصار ہر رنگ میں شامل حال رہتا ہے ورنہ افسانے یا ڈرامے کی کامیابی میں نمایاں طور پر فرق پڑجاتا ہے اس کی وجہ میں کبھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں۔ پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں اور خود تھیٹر بھی بہت چھوٹا سا ہے۔ چند دن ہوئے میں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو میو والیول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لئے بھی لندن کا ایک بہت چھوٹا سا تھیٹر منتخب کیا گیا اس تھیٹر کا نام لٹل تھیٹر یا چھوٹا تھیٹر ہے۔ باقی رہا امتیاز کا ترجمہ، میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اُٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کے متعلق ایک بسیط تنقیدی مضمون سپرد

قلم کر دیں تاکہ ''چترا'' اور ''تائیس'' اور ''مذہب اور سائنس'' اور ''عذرا'' اور ''لیلیٰ'' ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لئے ایک معیار مقرر ہوجائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں خصوصاًاس وقت جبکہ میرے زیر نظر صرف ''ہیبت ناک افسانے'' ہے اور میرا قلم صرف اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہناکہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں، اس وقت تک بےمعنی فقرہ ہے جب تک کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کردوں آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ ''گدھا'' کس کو کہتے ہیں۔ کسی انگریزی کے لئے اس لفظ کے معنی سیکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہوگیا۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ ''ابے گدھے'' سے لے کر ''خرِ عیسیٰ'' تک جو شعر وادب، فلسفہ ومذہب رسم وعادت، محاورہ اور روز مرہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے، اس کو منتقل کرنے کے لئے ایک عمرچاہیئے اور پھر اس کے لئے بصیرت، ذہانت مذاق اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ امتیاز کو خدا نے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعہٴ السنہ اور علم وادب کی تحصیل کے لئے وقف کررکھا ہے۔ ہاں وہ انگریزی جانتے ہیں اسی لئے جب کبھی ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھ دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھنے کے لئے ہندوستان میں مجھ سے بدرجہا بہتر نقاد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیاز مندوں میں سے ہوں۔ مجھے سنبھل کر قلم اٹھانا چاہیئے۔ مبادا قارئین میرے جذبات کی تو تعریف کریں لیکن میری تنقید کو محض اظہار نیازمندی سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

شام پڑ رہی تھی۔ فقیر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہوگیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے تو وہاں پڑ کر رات بسر کرے۔ او رکوٹ سمجھ لو یا جو کچھ سمجھ لو ایک بورا سا اس کے پاس تھا۔ اسی میں گھس گیا۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھڑی سی باندھ کر کندھے پر اُٹھا رکھی تھی، تکیے کی جگہ اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے چور چور ہو رہا تھا بھوکا تھا، پڑ رہا اور نیلے آسمان پر تاروں کو ایک ایک کرکے اُبھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چپ چاپ تھیں۔ دور بہت فاصلے پر گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بڈھے کا دل بھر آیا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا میرے ماں باپ کون تھے۔ لاوارث کو ثواب کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا۔ اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔

بچہ ہی سا تھا تو وہاں سے نکل بھاگا۔ ادھر اُدھر اس فکر میں پھرنے لگا کہ کہیں کچھ کام مل جائے جس سے روٹیوں کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کٹھن زندگی گزررہی تھی۔ دکھوں کے سوا جینے کا کوئی مزا نہ دیکھا تھا۔ جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں چکیوں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اُٹھائی تھی۔ چاہا تھا کہ مرجائے۔ ایسی نیند سوئے کہ پھر کبھی آنکھ نہ کھل سکے۔ جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا۔ بےدرد تھے، شکی تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ہر ایک اس سے ڈرتا ہے بچے دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اس کو چھتھیڑوں میں دیکھ کربھونکنے لگتے۔ پھر بھی کبھی کسی کا برا نہ چاہا تھا۔ سیدھی سادی اور ''نیک طبیعت پائی تھی۔ جسے مصیبتوں نے مردہ بنا دیا تھا۔

یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک ''اہل زبان'' کے لئے باعث فخر وناز رہی۔ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان رتن ناتھ سرشار، داغ اور امیر، نذیر احمد، اور محمد حسین آزاد سے ورثہ میں ملی۔ اور اسی خزانے کے سکوں سے جنہیں خود ''اہل زبان، محض ممسکوں کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل مل کر خوش ہولیتے ہیں۔ اب لاہور کا ادیب فرانس اور انگلستان کا متاع ادب خرید خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس قدیم دولت سے ادب جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف امتیاز ہی کا کام تھا۔

اب ایک اور صفحے کو پڑھئے۔ جو دہلی اور لکھنوٴ دونوں سے بےنیاز ہے بلکہ جو اکثر پرانی وضع کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برہم کر دے گا۔

اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ آخر کار جب" میں نے میز پر سے نظریں اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے میرا مطالعہ کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ ذرا دیر تک میں بےحس وحرکت بیٹھا رہا۔ دماغ پر کسل کی وہ کیفیت طاری تھی جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بے تعلق نظروں سے ادھر اُدھر تکتا رہا۔ مدھم روشنی میں ہر چیز دھندلی اور بےوضع نظر آرہی تھی۔ اگر کچھ روشنی تھی تو ان جگھوں پر جہاں غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعائیں میز، آئینے اور تصویر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھی۔ کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ اس میں شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست زاوئے تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا۔ شام کا دھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہر چیز کو جیسے نگلنے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اُٹھی

ہے۔ وہ گوشت پوست سے منڈھا گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے۔ حلقوں میں آنکھیں جڑی گئی ہیں۔ بہت جلد کسی انوکھے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا ہے۔ وہ سر جمی ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر استہزا کا ایک تبسم تھا۔ یہ کوئی اس قسم کا گریزپا تصور نہ تھا جو انسان کا تخیل پیدا کرلیا کرتا ہے۔ یہ چہرہ ایسی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ تو میں بےقرار ہوگیا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھولوں لیکن یکلخت رخسار جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہوگئے۔ ایک ہلکی سی گمر نے اسے ملفوف کر لیا۔۔۔ اور پھر مجھے عام کھوپڑیوں کی طرح ایک کھوپڑی نظر آنے لگی"۔

یہ اردو نہ بازار میں پیدا ہوئی نہ گھر میں۔ اس نے نہ لشکر میں پرورش پائی نہ قلعے میں۔ بلکہ یہ صرف ملک کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ نئی تہذیب کی ضروریات نے اسے ایجاد کیا او رمطالعے اور خوش مذاقی نے اسے یہ دلفریب صورت بخشی۔ اس بارے میں ہمارا ادب سجاد حیدر، ظفر علی خاں، ڈاکٹر اقبال اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے۔ جنہوں نے بعض ایسے دروازے کھول دیئے کہ ترقی کےکئی راستے آنکھوں کےسامنے پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے میں نے امتیاز کی قادر الکلامی کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ ایک ہی تصنیف میں اتنے متبائن ڈھنگ یک رنگی کے منافی ہیں۔ اس کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ جب آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیرملکی تصنیف میں ڈوبی ہوئی ہو،محض اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی ضیافت طبع کے لئے کسی دیسی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تو یہ یقین مانیے انشاء پردازی کا کوئی ایسا فن نہ ہوگا جس سے آپ بےنیازی برت سکیں۔ اس کے لئے قلم نہیں بلکہ دسوں انگلیاں دس چراغ ہونی چاہئیں۔

پطرس ۔ از کیمبرج
(مخزن مئی ۱۹۲۸ء)

* * *

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی کے افسانہ میں ایک لڑکی دوسری کے

متعلق کہتی ہے کہ ''سعیدہ موٹی تھی تو کیا، کمزور تو حد سے زیادہ تھی بےچاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے''۔ جب میں نے عصمت کی کلیاں اور چوٹیں دونوں مجموعے ختم کر لئے اور جو چند دیباچے اور مضامین ان کے مداحین اور معترضین نے ان پر ازرہ تنقید وتعارف لکھے ہیں ان سے بہرہ یاب ہوچکا تو استعارے کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا۔ ''لوگ جسم دیکھتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے''۔

اس فقرے کے معانی کو کھینچ تان کر پھیلا لیجئے، اور اس پر تھوڑا سا فلسفیانہ رنگ پھیر لیجئے تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کو بیان کرنے کا اچھا خاص بہانہ ہاتھ آجاتا ہے جو حال فربہی کا ہے وہی حال کئی او رمعروف اور متدا دل اور لیبلوں کا ہے جو مستعمل الفاظ اور عادات مستمرہ کی شکل میں قسم قسم کی اشیاء پر چپکے نظر آتے ہیں۔ ذہنی کسالت اور خوف اور بزدلی کے مارے ہم اکثر فیصلے لیبلوں ہی کو دیکھ کر صادر کر دیتے ہیں۔ ان سے آگے نکل کر اصل چیز کو جانچنے اور تولنے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ مامتا اور عشق پر دل گدازی کا لیبل مدت سے لگا ہوا ہے اس لئے جہاں ان کا ذکر آئے کہنے اور سننے والے دونوں ایک علّو اور ایک پاکیزہ رقت کے لئے پطے ہی سے تیار ہو بیٹھتے ہیں۔ جنسی مشاغل تحقیق کہ پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان بغیر کراہت یا اخلاقی غیظ کے ہو تو لوگ برہم ہوجاتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا سا پیار جاننا چاہئے کہ پاک محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے لہٰذا بہن بھائی کے درمیان بجز اس جذبۂ عالیہ کے کسی اور تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب ضرور سمجھی جاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے رہنما بھی اندھا دھند ایسے ہی کلیئے ہوتے تو ادب ان کی بہترین انشا سے محروم رہ جاتا لیکن ان کی بصیرت اس سے کہیں زیادہ دوررس ہے۔ وہ لیبلوں کے فریب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کئی کنیتیں ایسی ہیں جن سے وہ اکیلے میں دوچار ہوتے نہیں گھبراتیں۔ ایسے انشا پرداز کا بغیر حوصلہ مشاہدہ، وقت نظر اور جرأت بیان کے گزارہ نہیں۔ اور یہ ادیب کی خوش قسمتی ہے کہ عصمت کو یہ تینوں نعمتیں میسر ہیں۔ برخلاف اس کے احساس محرومی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جرأت اور

وقت نظر میں سے عصمت کے نقادوں کو حصہ وافر نہیں ملا۔ فی الحال ان کا ذکر جانے دیجئے جن کو عصمت کی تحریروں میں اپنے اخلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیبل گوند سے چپکے ہوئے نہیں میخوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی لکیروں والی جدول بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے ان کا حرام ہے نامحرم کا ذکر ہم مقرر کر چکے ہیں کہ فحش ہے۔ محرم کا ذکر معاملہ بندی ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا بچہ فطرت کو منظور ہے تو ہوا کرے، ہمارے ادب کو منظور نہیں۔ اور یہ فطرت کا مطالعہ؟ محض ایک ڈھونگ! آوارہ مزاجوں کا عذر آوارگی! ہمیں بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور نہ کرسکا تو اب کسی کی کیا مجال ہے؟ ہم جب بھی کھلونے سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلائیں گے... ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی
کوئی ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے اور اپنوں کی شکایت ہے، بیگانوں کی سی نہیں۔ جو عصمت چغتائی کے قدر دان اور مداح ہیں ان لیبلوں کے مضامین کو پڑھ کر روح میں ایک بالیدگی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ گلہ ہے کہ وہ بھی مر پھر کر لیبلوں ہی کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ افسوس کہ عصمت مرد نہیں اور افسوس کہ لیبلوں میں سے سب سے بڑا اور گمراہ کن لیبل عورت ہے۔ مرد ذات کے قرنوں کے خرابوں اور محرومیوں سے چپکا ہوا۔ عورت دلفریب ہے، مکار ہے، صنف نازک ہے، ایک معمہ ہے، کمزور ہے، کم عقل ہے، مجموعۂ اضداد ہے۔ جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چارگھڑے گھڑائے معنی ذہن اُگل کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اسی فریب میں آکر ہونہار اور ذہین دیباچہ نویس فرماتے ہیں:

"عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُر پیچ اور دشوارگزار نظر آتے ہیں۔ میں شاعری نہیں کررہا اور اگر اس بات میں شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو سچی بات میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے۔ اس کے باطن میں ہے۔"

اب نہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا لیبل کس قسم کی چیزوں پر لگا رکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو وہ جوہر بھی کھلتا جو بہ قول ان کے عصمت کے افسانوں میں ہے لیکن ان کے رنگین تصورات ومفروضات کے خلوت کدہ میں ہمیں کیونکر باریابی ہوسکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کی تہہ میں کام کر

رہے ہیں۔ دیباچے کا مقطع ہے:

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگار کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔" لیجئے۔ عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر میرے عزیز کی ناقدرانہ نظر بہک گئی۔ دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کا جوہر لیکن آخر کہہ گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح کہ دو ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب وتحسین ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں (یعنی مردوں) کے لئے شرم و ندامت کا موجب ہے۔ ایک اور مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں۔ عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں اردو ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا"۔ گویا ادب بھی کوئی ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورت اور مردوں کے میچ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلٹ کا رتبہ مسلم۔ لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تک ہی ملا اور بوجھوں تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے۔ خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جبلّی اور بنیادی جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہرحال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنا پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔

اسی طرح جہاں کسی افسانے میں خاندان، گھر بار، اعزا واقربا کا ذکر آگیا۔ یا کسی متمول لڑکے نے کسی مفلس لڑکی پر ہاتھ ڈالا، جوشیلے اور دردمند دل رکھنے والے نقادوں نے مسرت کا نعرہ لگایا اور بغلیں بجائیں کہ سماج کی خبر لی جا رہی ہے۔ اب غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ عصمت کے اچھے افسانوں میں ماحول محض اس لئے شامل فسانہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ کردار کہیں تو رہیں گے۔ کسی سے تو ملیں گے افسانہ کا جو ڈھانچہ ہے اس کا کوئی گوشت پوست تو ہوگا پھر اس کے بغیر بھی چارہ نہیں کہ وہ ماحول ایک نہ ایک معروف طبقے کا ماحول ہو۔ بودوباش کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ تو پیش نظر رکھنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یہ ماحول جن معاشی اصولوں کی وجہ سے پیدا ہوا خود وہ اصول جانچے اور پرکھے جا رہے ہیں۔ عصمت کے بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن پر شبہ ہوتا ہے کہ سماج کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے جہاں بھی سماج کو اپنا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے ان کا ہاتھ جھوٹا ہی پڑا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سماج کی جن باتوں سے عصمت کا جی برا ہوتا ہے ان پر عصمت نے غور ضرور کیا

ہوگا۔ لیکن تلخی کام ودہن ابھی ان کے رگوپے تک نہیں پہنچی اور جب تک یہ نصیب نہ ہو سماجی کمزوریوں پر اخباروں میں مضمون لکھ لینے چاہیں۔ ان کو فن کی لپیٹ میں لانے کا خیال چھوڑ دینا چاہئے۔ عصمت کو فی الحقیقت شغف سماج سے نہیں شخصیتوں بلکہ اشخاص سے ہے۔ ان کے جوش اور ہوس سے۔ ان کی تھرتھراہٹ اور کپکپی سے، ان کی باہمی کشمکش اور عداوت اور فریب کاری سے، غرض ان تمام کیفیتوں سے جو انسان پر جب طاری ہوتی ہیں تو جسم پھڑکنے لگتا ہے اور دوران خون تیز ہوجاتا ہے یا اعصاب میں الجھاؤ اور طبیعت میں تناؤ پیدا ہوجاتا ہے اگر عصمت اور سماج کا باہم ذکر اس نقطہٗ نظر سے کیا جائے کہ ان کی سی انشاء ان کا سارا رجحان اور ان کا سااسلوب انتخاب ایک خاص زمانے اور خاصی سماجی کشمکش کی پیدوار ہیں تو یہبحث مناسب ہی نہیں بلکہ نتیجہ خیز بھی ہوگی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اردو میں عصمت جیسے ادیب اس صدی کے اوائل میں بھی منفقود تھے۔ اور اس سے پہلے کا ذکر ہی کیا۔ یہ ایک امر واقعہ ہے اور اس میں کئی دلچسپ نکتے مضمر ہیں۔ جن کی توضیع یقیناًخیال انگیز ہوگی۔ لیکن حالات سے اثر پذیر ہونا اور حالات کا مفسر ہونا دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس بات کا مطالعہ کرنا ہوکہ بعض سماجی حالات نے کیونکر عصمت جیسی انشا پرداز کو پیدا کیا تو شوق سے کیجئے لیکن اس شوق میں خواہ مخواہ سماج کی نباضی عصمت کے سر نہ منڈھ دیجئے۔ سیب درخت سے گرا تو یقیناً کششِ ثقل ہی کی وجہ سے گرا۔ لیکن اس کارگزاری کے صلہ میں سیب کا نام نیوٹن نہیں رکھا جا سکتا۔ نہ سیب کو سیب سمجھنے میں کچھ اس کی ہیٹی ہوتی ہے۔

عصمت کے دونوں مجموعوں میں ڈرامے، افسانے اور اسکیچ تینوں قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ ان میں ڈرامے سب سے کمزور ہیں اور اس کی کئی وجوہ ہیں اول تو یہ کہ ڈرامے کی ٹیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی یا یہ کہیےکہ ابھی تک ان کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ پلاٹ کو مناظر میں تقسیم کرتی ہے تو ناپ کی قینچی سے نہیں کترتیں۔ یونہی دانتوں سے چیر پھاڑ کر چیتھڑے بنا ڈالتی ہیں چنانچہ پھوسڑ جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی سین جب پھیلتا ہے تو سمٹے بغیر ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان کہیں بھی رک جائے۔ خیر اس قدر نازک مزاجی سے کیا حاصل؟ کھیر نہ سہی دلیا ہی سہی پیٹ بھر جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ڈرامے کو ڈرامہ نہ سمجھے۔ کہانی سمجھ کر پڑھیئے اور فرض کر لیجئے کہ کہانی نے ڈرامے کا لباس کسی ضرورت سے نہیں بلکہ محض تنوع کی خاطر پہن رکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ رواداری سے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ کہانی کو ڈرامے کی شکل دی جائے تو ایک جبر اپنے اوپر ضرور کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ قصہ اول سے آخر تک مع اپنے نشیب وفراز کے تمام تر افراد قصہ ہی کے اقوال وافعال کے

ذریعے بیان کرنا پڑتا ہے مصنف سے یہ آزادی پھر چھن جاتی ہے کہ ساتھ کرداروں کے جذبات، خیالات کو اپنی زبان سے واضح کرتا جائے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پابندی عصمت کے بس کا روگ نہیں۔ افسانہ ہو تو عصمت کو کسی انوٹ یا تیور کے واضح کرنے میں دقّت پیش نہیں آتی۔ انہیں افسانہ نویس کے اس حق سے فائدہ اُٹھانا خوب آتا ہے کہ جب چاہا کیریکٹر سے کچھکہلوالیا۔ جب چاہا خود کچھ کہہ لیا۔ لیکن جب اپنی زبان بند ہو اور سب کھیل کیریکٹروں ہی کو کھیلنا ہو تو عصمت قاصر رہ جاتی ہے۔ اور ان مجبوریوں میں گھر کر ان کا مطلب اکثر فوت ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مکالمے بھی پھسپھسے ہوجاتے ہیں اور ان میں اس کردار پن کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا۔ جو ان کے افسانوں کے مکالموں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ (پردے کے پیچھے میں کس قدر چستی اور پھرتیلا پن ہے) بعض اوقات تو مکالمہ کچھ ایسا بےجوڑ ہوجاتا ہے کہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا واقعہ کیا پیش آیا۔ چنانچہ ان کا ڈرامہ ''انتخاب'' کے واقعات پیشتر اس کے کہ سمجھ میں آسکیں بہت کچھ وضاحت کے محتاج ہیں۔ (یہ نقص ان کے افسانہ ''تاریکی'' میں بھی رہ گیا ہے) ڈرامہ نویس کو تو اجازت نہیں کہ وہ سیدھے منہ ہم سے بات کرے۔ باقی رہے کیریکٹر سو وہ آپس میں الجھی سلجھی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ (ڈرامہ جوٹھمرا) مگر ہمارے پلے کچھ نہیں پڑنے دیتے۔ ڈرامہ نویس عدم تعاون پر مجبور ہیں اور کیریکٹروں کو تعاون کا سلیقہ نہیں۔ ان حالات میں ڈرامہ کامیاب ہو تو کیونکر؟ پھر ان ڈراموں میں (جہاں تک میری سمجھ میں آئے) عصمت کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ چند اشخاص نہیں چند ٹائپ پیش کریں۔ یعنی ہر شخص ایک طبقہ کا نمائندہ بن کر سامنے آئے۔ مگر اس کے لئے اشخاص کا ادراک نہیں گروہ کا احساس چاہئے اور عصمت اور گروہ میں وہ انہماک نہیں جو اشخاص میں ہے تو پھر نہ معلوم انہیں یہ مصیبت کیوں مول لی؟

علاوہ ان سب باتوں کے ان ڈراموں کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں عصمت نے جس قسم کے لوگوں کا نقشہ کھینچنا چاہا ہے، ان سے وہ طبعاً گھل مل نہیں سکتیں یعنی وہ مرفہ الحال لوگ جو کہلاتے تعلیم یافتہ ہیں مگر جن کی ترکیب میں تعلیم کم اور بےیافتہ زیادہ ہوتی ہیں۔ جو خوش حالی، بےحسی، انحطاط اور اپنے رنگ وروغن کے بل پر اپنے مشاغل اور اپنی گفتگو میں بےفکراپن اور چمک پیدا کرلیتے ہیں جس کی بدولت وہ ''سمارٹ سیٹ'' کہلاتے ہیں۔ اور کم نصیب لوگ کچھ ان سے نفرت کچھ ان پر شک کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس طبقے کی بعض حماقتوں اور خود فریبیوں پر عصمت کو غصہ آتا ہے جس کو وہ بیان کرنا چاہتی ہیں۔ اور اس کی عشرتوں پر تھوڑا سا رشک جس کو وہ خود بھی نہیں جانتیں لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس چمکیلے طبقہ کو انہوں نے دور ہی سے دیکھا ہے۔ قریب آنے کا موقع نہیں ملا کہ

اس کے نقوش اور خدوخال واضح دکھائی دیتے اور اس کے خوب وزشت اور ظاہر وباطن کا وہ اچھی طرح موازنہ کرسکتیں۔ چنانچہ جب عصمت اس قسم کے کیریکٹروں یا ان کے ماحول کی تصویر کھینچتی ہیں تو نوک پلک کبھی درست نہیں ہوتی۔ چھری، کانٹے، ''ارغنوں'' (یعنی چہ؟) ٹینس، ڈرائنگ روم، ڈنر سیٹ، الم غلم اس قسم کی اصلی اور خیالی چیزیں جمع کرکے ایک کباڑ خانہ سا بنا لیتی ہیں۔ گو ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس سازو سامان سے امیرانہ ٹھاٹھ باندھا جائے اور کچھ اس یقین کے ساتھ اسباب چنتی جاتی ہیں کہ ان کی سادگی پر رشک آتا ہے۔

کیریکٹروں کی گفتگو اور حرکتیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جب مصنف ہنسائے تو رونا آتا ہے اور رلائے تو ہنسی آتی ہے۔ ایک تصنع تو ان میں وہ ہے جس کا مصنف کو علم ہے لیکن ایک تصنع ان میں ایسا بھی آجاتا ہے جس سے مصنف خود بےخبر ہے، اور جو دراصل اس کے اپنے تصنع کا عکس ہے یعنی کیریکٹروں کی سطیحت کو تو بے نقاب کرنا ہی تھا اپنی سطحیت بھی ساتھ بے نقاب ہو رہی ہے۔ ایکٹروں سے پطے کیریکٹر خود ایکٹ کرتے پیدا (situation) ہیں۔ بات بات پر اپنی زندگی میں تھیٹر کی سی سچوایشن کر لیتے ہیں اور کچھ اس طرح بنتے ہیں کہ ان کے تو خیر خود ڈرامہ نویس کے حسن مذاق پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ ''سانپ'' میں عصمت نے چند ایسی عورتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بزعم مصنف ''شکاری عورتیں'' ہیں یعنی وہ رنگین تریا چلتر ہے مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ جیسے بلّی چوہے سے کھیلتی ہے۔ لیکن ان کی تھکی ہوئی باتیں سنئے اور ان کی اکتا دینے والی خوش فعلیوں کا تماشا کیجئے تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ کسی چوہے کا شکار تو یہ شاید کرلیں لیکن اس سے زیادہ کی امید بےچاریوں سے خام خیالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے چند کم عقل چھوکریاں ہیں۔ جنھوں نے کوئی ارزاں قسم کا خوش پوش امریکن فلم دیکھ لیا ہے۔ اور گھر میں دو ایک جگہ صوفے، کرسیاں بچھا کر نقل اتارنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ قیاس اس امکان کو بھی ردنہیں کرتا کہ وہ فلم خود مصنف ہی نے دیکھا ہو اور اس کی ارزانی کا احساس اس کو نہ ہوا ہو۔ ایک مکالمہ تو اس ڈرامے میں ایسا ہے کہ اپنے بےساختہ میلوڈرامیٹک اسلوب کی وجہ سے کشتِ زعفران سے کم نہیں۔ رفیعہ کی منگنی غفار سے ہو چکی ہے لیکن اب وہ اس سے نہیں ظفر سے شادی کرے گی۔ غفار کو اس سانحہٗ جانکاہ کا علم یوں ہوتا ہے:

رفیعہ۔ نہیں میں تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی۔

غفار۔ (جوش سے) برباد نہیں۔ تم میری زندگی آباد کرو گی۔

رفیعہ۔ نہیں، میں تمہیں نگل جاؤں گی۔ سانپ جو ٹھہری۔

غفار۔ (شدت جوش سے کانپ کر) کیسی باتیں کرتی ہو، تم مجھے نگل بھی

جاؤ، تو میرے لئے عین راحت ہوگی۔
خالدہ۔ (رفیعہ کی سہیلی) مگر اب تو رفیعہ نے فیصلہ کرلیا۔
غفار۔ (چونک کر) کیا فیصلہ کرلیا؟
خالدہ۔ یہی کہ وہ تمہیں نہ نگلے گی۔
رفیعہ۔ ہاں اب تو میں ظفر کو نگلوں گی۔
(ظفر پریشان ہو کر مسکراتا ہے)
!غفار۔ (سمجھ کر) تو... تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ٹھکرا رہی ہو
رفیہ۔ اُونہہ۔ اب تم نے بھی غلیظ شاعری شروع کر دی۔
غفار۔ (پریشانی سے انگلیاں چٹخا کر) اور ظفر تم مجھے دھوکا دیتے رہے۔
ظفر۔ غفار، بچہ نہ بنو، یہ فتنہ تمہارے بس کا نہ تھا۔ شکر کرو کہ میرے ہی اوپر بیتی اور تم بچ گئے۔ تم دیکھنا میری وہ گت بنائے گی کہ توبہ ہی بھلی۔
غفار۔ کاش میری ہی وہ درگت بن جاتی۔
...خالدہ۔ مگر غفار سوچو تو
غفار۔ ایک عرصہ دراز سے بزرگوں نے یہ بات طے کر دی تھی۔
خالدہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آبائی حق تو تمہارا ہے پر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آن پڑا !ہے۔ وہ ایک ضدی ہے
غفار۔ (اندوہ گیں ہو کر) میں --جا رہا ہوں (نہایت اداسی سے) رفیعہ! خدا کرےتم خوش رہو۔
عصمت اس سین کو کامک سین سمجھ کر لکھتیں تو شاید ڈرامہ نویس میں ان کا نام رہ جاتا۔ لیکن افسوس کہ ان کے ہونٹوں پر مجھے مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ اور جب مصنف نے ہنسانے والی باتیں لکھیں اور خود سے ہنسی کی کوئی بات نظر نہ آئے تو افسوس ہوتا ہے۔کچھ ایسا ہی بے تکا پن ڈراموں کے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں عصمت نے ان جدید نما چمکیلے لوگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ہی ٹھیک بیٹھی ہیں نہ کیریکٹر کا ناک نقشہ ہی درست ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑ لئے ہیں۔ اور پیشہ ور افسانہ نویسوں کی طرح رسمی رومان کا رنگ دے کر جھوٹ موٹ ایک بات بنا لی ہے۔ ''پنکچر'' اور ''شادی'' پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے اور ''میرا بچہ'' میں تو برنارڈ شا کے''' آرمز اینڈ دی مین'' کے پہلے سین پر کچھ اس طرح سے ہاتھ صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں۔
یہ سیلیا اور نیلی اور ''ارغنوں'' اور پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ اجنبی رہتی ہیں اس کی تہہ کو وہ جب پہنچیں گی۔ تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ان کی دنیا وہی ہے جو ان کے بہتر افسانوں یعنی جوانی، ڈائن، نیرا، بھول بھلیاں ، ساس، بیمار اور تل میں پائی جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس

میں عورتیں پردے کے پیچھے سے فقرے چست کرتی ہیں جس میں زینوں پر
اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ جس میں نوا ڑ کی
پلنگڑیوں پر پٹاریاں رکھی ہیں۔ معترانیوں کی جوان بھوئیں کمر لچکا کر چلتی
ہیں۔ اکھڑلڑکیاں گوبر بنتی پھرتی ہیں اور

A letter from a Father to a Son

Hotel Maria Christina, Mexico, D.F.
Dated 11th May 1949

My Dear Rooney,

I sent off a cable to you when I received your most vivid letter & the 'Presto' photograph. Didn't the Presto remind you of "fatafat foto" - it did me. Your letter was delightful & reassuring as it clearly showed that you liked being where you were & doing what you were doing. This is the best tonic you can have for life ahead of you. Do you know that between this letter of yours & your previous letters one could feel the difference of several years of maturity, as if merely by the fact of launching upon a career of your own & by being in different surroundings away from home, you had added many years of maturity to your being. Within a week I'll be sending you a draft for 40 or 50 pounds, so that your bank account looks a little richer and you have less anxiety about possible emergencies. Luckily you have known a great deal about England from books, magazines, etc, etc & directly from persons who have lived there, including such travelers as me & uncle ZAB. I am sure therefore that you would not have had the same strange & sometimes baffling reactions about your environment that I had, for example, when I arrived at Victoria Station, London in 1926 with no one to meet me there & heard unintelligible cockney from the railway porter for practically the first time in my life -- also when I didn't know whether a taxi would or would not be beyond my means, or whether I should or should not speak to a woman. You know all that it is important to know & have seen more of life than I had seen at your age. Nevertheless parents have an incurable habit of giving good advice, in season & out of it, even when it is not needed. It arises from affection and from protective desires & from anxiety for your welfare, born of love. Let me therefore give way to this incurable habit, & if you find my advice superfluous, as I sincerely hope you will -- I am sure you will -- you can ignore it forgivingly -- that is to say without being irritated by it. I will make it as brief as I can.

First of all, a very simple piece of advice -- avoid breaking the law. I don't mean resist the temptation of committing a murder or robbing a bank. Your life is not

heroic enough to have such monumental desires, as you haven't had the ample opportunities that are provided by having been brought up amongst hoodlums & gangsters. But one is always liable to break laws in little things. One had better avoid that in foreign countries. It is bad manners for a foreigner to enjoy the hospitality of a country & then break a queue or traffic rules or rationing regulations or evade taxes. It is also suicidal; for you'll find that if you break a law the consequences will depress you more in a foreign country away from home than if you broke the same law in Lahore. Deep down being civilized, we are always afraid of breaking the law & it is no use surrounding ourselves with avoidable fears specially in another country where these fears are likely to be large. Secondly, women. This is not a delicate subject. I am not going to speak about the "delicate" side of this matter. There is nothing concerning that aspect of which you do not know or which your good senses, good breeding & decent values will not guide you in. And if you do not have the good values, one or a thousand letters from me will not give them to you. All that I wish to say is that when you meet women, you are bound to show off a little -- we all tend to do so, more or less according to the amount of vanity & the amount of desire to appear good & great in addition to being good or great. But do not try to impress women or for that matter anyone with your money. This is vulgar & besides can have disastrous consequences purely from the worldly point of view. Do not transform what can be a very pleasant experience into a vulgar or an expensive hobby. It is like smoking. Smoke if you want to -- it is a mildly sinful, mildly expensive & mildly soothing activity, but there is a difference between smoking & chain smoking; also between smoking & taking drugs like opium. The next two or three years are important in your life. On them depends how comfortable your life as an individual or as the husband of a wife or the father of children will be in years to come. Keep these 2 or 3 years reasonably free from entanglements that may be too big for you to handle. Emotional upheavals -- no one can help or condemn, but alas they have social consequences. These latter come up against the hard facts of life. If you would like to lead a life of pure emotions, caring neither for whether you starve nor for whether you are socially acceptable -- you would be a great man, & for me to advise you would be to insult you. But till you are sure that you have their measure of greatness, you will need all the caution & forethought that mediocre, average men, which most of us are, need for ordering their pretty undistinguished lives. Thirdly, as time goes on, your letters to us will be come less & less frequent & also more & more brief. This is nothing to feel guilty about. It will be a sign, not of callousness, but of an expanding horizon & a change in perspective. But two things I will still like you to do. Do write regularly to Mummy -- however brief the letters. You are more important to her than she is to you. Also with the years her need of you will grow greater, your need of hers less. Therefore be kind & considerate. Her demands will be urgent to her, but not great or difficult to fulfill. Also keep in constant touch with Mansoor. Do not let his friendship wither away for want of feeding. If he was only your brother, he could some time or other become a

nuisance in life. But luckily he is also a very good friend & a friend is never, never worth losing. Besides, you are going to work in the same firm for many years & it will be comforting to both of you to retain the bond you have. As for me, write to me just when you feel, whether it is for money, for advice, for consolation or for mere fun. Your letters will always be welcome to me & I don't think I'll ever fail to understand your point of view or to sympathize with you or to love you, whatever your joys or your pains may be and however right or wrong you may be. In your work, you can only use the intelligence & the character you possess. I cannot add to them by exhortations. But as one who has been a 'boss' in one way or another for many years, let me tell you that what bosses like & have a right to demand is that their employee should be above all, reliable. Not only your bosses but your friends have the same right to demand reliability of you. Your foolishness, your inefficiency, your weaknesses can all be overlooked by your friends & even viewed with affection if they feel that for moral values you can be absolutely depended on -- that you will not let them down. Bosses expect the same thing. However big the machine, & the organization and however impersonal their relations in & with that machine, they are after all human beings. Thank God that the highest pitch of a large-scale industrialization has not yet killed that fact. Above all, do not, if you can help it, create a crisis in your life -- that's all.

This letter has almost become like Polonius's speech to Laertes. I am too close to it to see whether it is full of clichés & as pompous as Polonious's string of wise sayings was. But I am not afraid of exposing my pompousness to you, if I have it in me. You & I have been friends for many years -- you have been a jolly fine companion to me & I do not mind if I reveal my worst weaknesses to you. I am sure you will forgive them, and at the worst will smile at them with understanding & affection.

I am studying the Mexican system of education, on behalf of our government. A large part of the Mexican population is illiterate & backward, but since the Mexican revolution of 1910, there is a great stirring of the soul in this baffling & picturesque country & their struggle to rise and redeem their cultural soul are fascinating and inspiring. This will take me right up to the end of June. After that I'll probably go to London -- to broadcast on Pakistan on the national & international network of the Canadian Broadcasting Corporation & to give a lecture or two at the McGill University at Montreal. All these are in response to invitations received. Thereafter, back home through London of course. And who knows I may steal time to look you up in Liverpool or you to look me up in London. I'll keep you fully informed of my movements & plans.

Mummy asked me to send you some clothes from here. I'll be sending you money instead, as clothes rationing is off in England -- sending stuff from here is expensive and complicated. A little later you might give me a picture of how

you stand financially, so that I send you a steady supply of filthy lucre according to your needs. I was going to say that I am not rich, but you know how rich or poor we are. What you may not know fully I that, nevertheless, at all times we should be not only ready but delighted to treat your needs as the most paramount in the family. Bless you and wish you the best of luck. Have a good time -- I am using good in the Greek sense. The Greeks had the word 'kalos' which meant three things at once -- the great, the good & the beautiful -- for in their great wisdom they realized that all three were inseparable.

With best of love,

Affectionately Daddy
P.S. Keep your Urdu alive. Ask Mansoor to keep you supplied with an occasional book or magazine. This is important.

To Haroon & Mansoor

August 13, 1956
To Mansoor & Haroon,

Dear Clan,

I have recently replied, though somewhat hurriedly, to M's recent letter which, among other things, announced a coming domestic event (CGG Branch of the family) in November. This morning I received H's letter of 8th August, acknowledging receipt of a stack of letters and photos from me. So Zubaida is gone to PSH. The change will do her a great deal of spiritual (and perhaps physical) good. More and more my wakeful and sleeping dreams are about Peshawar. My childhood, I realize now, was full of magic and new mental discoveries almost each day. How I wish I could go back to Peshawar. Alas, perhaps now I never shall. Even if I do, adulthood and its social obligations will keep hidden from my eyes the fairy-land that it was. How will I ever be able to walk the dusty road outside Kohati Gate and make my way to blossoming orchards heavy with dew; or smell the roasted meat in shops and eating-houses full of strange travelers from the heart of Asia; or stand in the crisp cold wind from the snow-peaked hills; or roam around the Sadar, contacting far-off England through second-hand detective magazines, or the smell of candy, biscuits and toilet soap that made up a "European" shop like Gai's……and so on……while in counterpoint ran my reading: Kipling and "Little Lord Fauntleroy" and the diwans of ghazal-writers with which our house was full, and debates about the interpretation of the Quran and the cool water in the pool of the mosque of Shah Wali Qattal. Sikandar

Bhaijan was a moharrir in the Octroi department. He was posted at one city gate or another checking and assessing the imports and I sat with him through the hot summer afternoons. But the Ghaz trees swayed overhead and the water from the earthen kuza was always sweet and cool, and the kabab and roti was delicious and the merchandise from the hills on camels and donkeys and mules was strange and varied and joined Turkestan to us by routes that we had never seen. Late in the afternoon would arrive bundles of snow wrapped up in rushes, collected by the folks in the hills during the winter to be sucked by the falooda-drinkers in the town in the summer….how can I see and flavour all this again? I shall merely go round the family as an elder and town like a celebrity and come back without a touch of colour or a moment of solitude or a spell of a dream? I am glad you have (Haroon) have started to learn Pushtu. Please don't be slap-dash about it. Do please learn its grammar properly. Believe me most Peshawaris make the same comic mistakes about gender that are supposed to make a Pathan's Urdu so hilariously funny, or an Englishman's Hindustani so superior or idiotic. For Haroon : The addresses you ask for are as follows 1) Mr. Datus C. Smith Jr., Franklin Publications Inc., 432 Fourth Avenue, New York 16, N.Y. (2) Mr. John D. Rockefeller III, No.1 Beekman Place, New York, N.Y.

For Haroon : "Gentility" does not mean "gentlemanliness". No doubt the dictionary would say so, but the word has acquired a slightly feeble, slightly outdated, slightly over-sensitive sense. Haroon, please give Ehsan Dar my most affectionate best wishes when you meet him next. Mansoor, please do the same to your Commissioner. Am glad to know Ehsan has settled down in the Army. Hope he has settled down. In any case ask him to count a hundred before he decides to kill his Major or hold a public meeting against his Adjutant. I spent the last weekend in the country-house of Dag Hammarskjold. About 60 miles from NY. Drove up in my own car. The grounds of the house are 73 acres of virgin forest and lake. The house is of knotted pine wood. Perfect stillness, you don't know how rare that is in USA. There are pockets of primeval quietude in the virgin forest that one can still associate with the Red Indians and early colonials and Hiawatha, but they are difficult to get as they are all private property. We have a "Meditation Room" in the UN, a sort of temple dedicated to no particular religion, where the devout, who think God should have been prominently mentioned in the first Article of the Charter, might do their best, when they feel like it. Recently we have enlarged the room a little and redecorated it. In the centre will be one piece of iron ore (metal both of peace and war) lit from the ceiling by a grey beam, the rest of the room in semidarkness with one wall decorated with a mural which we hope to persuade Braque to do for us. I am hoping

the American poet Robert Frost will do a poem. I am going to see him Aug 17. He is over eighty years of age and lives on a farm in Ripton (Vermont) about 350 from here. I'll go to Albany by train, stop the night there and then next go to and return from Ripton by car. Back here on Saturday, I hope. Unless he asks me to stay, which I hope he will. All in all, it should be quite a bit of adventure. It is like going to Chakdara etc to see Dr. Iqbal. + + + + Rashid-ud-Din, a Pakistani in the UN secretariat will be going to Pakistan on home leave at the end of September. I'll send with him an overcoat. This is brand new. Worn it only 3 evenings. Want to get rid of it as it is too heavy for me. I was a stronger man when I bought it than now. You can decide among the two of it what to do with it. It will be a little too big for M and a little too tight for H. This will pose a nice little problem for both of you. Rashid will give it to Taqi, from whom you can arrange to collect it at your convenience. Have noted from your letter Haroon, that Taqi thinks Mrs. Faryar's luggage has not yet left NY. Will make enquiries and will expedite if necessary.

The dusk is falling. I am to dine tonight at the Austrian Ambassador's, black tie, which I hate. I don't wear a white jacket, as I haven't got one. Why have a white jacket for about two evenings in the year? A black jacket is too warm, at least as long as one is in the street. The rooms are air-cooled and don't matter. This has been a hot summer, most days the temperature has been between 70 and 80, which is quite hot for this great prison of a New York, where there are too many human beings crowded together on the one small island of Manhattan. On weekends the highways are packed tight with cars.

Love to the clan. Yours affectionately,
Chief

To Haroon --- Copy to Mansoor

August 28, 1955
To Haroon --- Copy to Mansoor,

My dearest Haroon. Many thanks for your letter of August 15. Your account of your holiday at Nathia reminded me of some of the most thrilling experiences of my childhood. It was quite an adventure to travel from Peshawar to Nathia and if it lacked any colour of the rainbow I supplied it from the inexhaustible paint-box of my own imagination. One went to Hasan Abdal (If you find out what Abdal means, you will see what a strange name this is) by train, then by stage-coach, or rather stage-

tonga carrying the Royal mail to Abbottabad, and then on an emaciated, bony hack (but it was like Don Quixote's "Rosinante" surely) to Nathia. The horses were changed every 20 miles or so and the driver had a bugle of shining copper and brass slung from his shoulder and I always hoped he would blow it on every possible excuse but alas he was so niggardly. "The trouble with youth," said Shaw, " is that it is often wasted on the young. The trouble, I then thought, with beautiful things like bugles and blacksmiths' bellows and potters wheels was that they were often wasted on the grown-ups when they should have been given to the young. The galloping journey always reminded me of the journey to Dover in the early part of "A Tale of 2 Cities". At Abbottabad there was always Mir Waliullah with his erudition, his Persian poetry, his incurable Hazara accent and his Kashmiri tea which but formed the base to layers and layers of thick clotted cream. The gullies to my mind, which was crammed with books, were some country of northern Europe or Canada. The houses had tiled sloping roofs and there were fireplaces and crackling logs of wood and one could roam about in thick virgin forest on a carpet of pine needles and the trees had exhilarating English names, pine, & chestnut and wild oak. There was so much forest lore that I loved to gather or imagined I was gathering like some sturdy lumberjack that I had read about and I felt so deeply happy at growing up within myself in a decent pure open-air sort of way like the boyscouts in Baden-Powell's book which I knew by heart but which I could not share with anyone for no other boy had ever read it or heard of it. And so there it was: a beautiful world carved out of nature by an inner lonesome exuberance of spirit and dreams of Europe and of far-off times and lands, - - all wrapped up in a soft romantic light. The dream never quite disappeared. During my college days I wrote a detective story (published in two installments in Imtiaz's monthly magazine "Kahkashan") which had the gullies as its background. This was mainly to lay my memories to rest in black & white somewhere, although it had many other ingredients too which I acquired later in my teens.

I have been typing this letter intermittently over about 4 days. Have had busy evenings and hurried mornings. A fatiguing week. I tire more easily now. I should have a brief siesta or at least a period of rest every afternoon, to break up the day into two. Easier to run a mile twice with an interval in between than to run 2 miles" says the doctor. But I don't always get the chance. However I mustn't talk like an invalid. Invalids are bores. I bore myself with such talk even before I bore others. Why did you have to go to Multan(!) to "see Geldart off"? where was he going from there? Into the desert? Sounds like a last farewell at the edge of civilization before a famous British executive disappears into the unknown, bent upon unraveling the mysteries of yoga at first hand. Re

company shares and your suggestions that I might buy some this winter on your behalf. How many? How much money? Please remember that I haven't as much money now as when I commuted my pension. I have been drawing on my rupee account for Zubaida and for setting up my house here and the car etc etc. Glad you are nearing a decision on Sunnyside. Hope Zubaida has not been too reluctant to fall in with the plan and to go Pakistan. Once or twice I have asked myself where I will live when I return to Pakistan. But depends on when I return, in what capacity and in what condition.

These things are at this stage too remote to be guessed intelligently and present plans cannot be held up by an unknown, hypothetical future. So please go ahead. Will you both be taking your vacations at the same time? In October? November? and spending it in Karachi?

Its Sat today. Might go off into the country to spend the afternoon on the private beach of a friend's house. But its cloudy and muggy and the weather-man has predicted some thunder-showers. So might stay at home and finish Aldous Huxley's new book (published two days ago) "The Genius & the Goddess". It is poor stuff. Written, it would seem, by a clever but immature schoolboy trying to imitate A.H. of 20 years ago. NY Times (Sunday edition: magazine section) are publishing a full length article on me with photos etc. The article has been ready for many weeks. They are waiting for a suitable moment. They have their own theories of timing. So I don't know exactly when it will see the light of day, but will of course send you copies.

Have had the typewriter overhauled ($11) mostly to send a carbon copy to one of you of the letter I send to the other. Seems the only feasible method of keeping the "crossing of the wires" to the minimum. Good idea, don't you think? There are many things I like to say to both of you, but its tiring to have to repeat. For the moment the typewriter seems to solve this problem. When I get bored with this I'll think of something else.

Political news from Pakistan is as usual confusing. Difficult to sort out the plot of a play in which every other character is called Muhammad Ali, and somebody is always being dismissed. But I am glad that I.M. and M.A. are GG and PM. They should form a very good combination. Amjad is returning to Pakistan to become (so it is rumored) the Foreign Minister. Please give my love to Zubaida, Roshan, Nina, Tahir, Xain and the new unnamed Ninette (i.e. daughter of Nina).

Yours most affectionately,
Chief

Biography

Ahmed Shah Bokhari (Patras) was born in Peshawar on 1st October 1898. His early education was in Peshawar. In 1916 he moved from Islamia College, Peshawar to joinGovernment College, Lahore.

In 1922 he completed his M.A. in English from Government College, Lahore, and was appointed as lecturer at Government College, Lahore. He did this job from 1922 - 1925.

In 1923 he married Zubaida Wanchoo, a Punjabi-speaking Kashmiri lady, and daughter of a Superintendent of Police. They had three children - two sons Mansoor & Haroon, and a daughter Roshan Ara. Roshan Ara died as a child.

From 1925 - 1927 he studied at Emmanuel College, Cambridge University to complete a Tripos in English, with a first class first

From 1927 - 1939 he was a Professor at Government College Lahore. During this period his literary pursuits and teaching skills flourished.

In 1927 he published his famous essays "Patras Kay Mazameen", which had been written a few years earlier.

In 1939 he was appointed Deputy Director-General of All-India Radio in Delhi.

From 1941 - 1947 he remained Director General, All India Radio, Delhi

1947 - 1950 he was Principal, Government College Lahore. During this time he resurrected the Government College, and these years came to be known as the golden years of Government College Lahore.

From 1951 - 1954 he served as Pakistan's first Permanent Representative at the United Nations.

From 1954 - 1958, he worked with the Secretary General of the United nations, as the Under-Secretary of the United Nations, Head of Information

He passed away on 5th December 1958 in New York
and is buried in Valhalla Cemetery, New York.

کہ گوہر مقصودِ گفتگوست.....

(فیض احمد فیض)

دوستی تندہی اورمستعدی کا نام ہے یارو، محبت تو یونہی کہنے کی بات ہے۔ دیکھو تو مرروز میں تم میں سے ہر پاجی کو ٹیلیفون کرتا ہوں، ہر ایک کے گھر پہنچتا ہوں، اپنے گھر لاتا ہوں، کھلاتا ہوں، پلاتا ہوں، سیر کراتا ہوں، ہنساتا ہوں، شعر سناتا ہوں، پھر رات گئے بار بار سے سب کو گھر پہنچاتا ہوں، سب بیویوں کی بددعائیں میرے حساب میں لکھی جاتی ہیں، آدھی تنخواہ پٹرول میں اڑ جاتی ہے، یعنی اول نقصان مایہ، مایہ نہیں مائع یعنی پٹرول، دوم شماتت ہمسائی، ارے یار یہ شماتت کیا لفظ ہے، ش۔ ما۔ تت کچھ پنجابی گالی معلوم ہوتا ہے نہیں" ..... قہقہہ۔

کچھ تو خدا کا خوف کرودوستو۔ کسی کم بخت کو توفیق نہیں کہ کبھی خود می" اٹھ کر جو چلاآئے۔ میں کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہوں؟ شوفرہوں؟ میراثی ہوں؟ مجھے تنخواہ دیتے ہیں آپ؟ یا آپ میری معشوقائیں ہیں؟ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہے آپ کا؟ یا آپ کے ذمن مبارک سے حکمت و موعظمت کے وہ لعل و گہر برستے ہیں کہ اس ہیچمدان کا دامن گنج مائے گران مایہ، اوئے مایہ، پٹرول والا مائع نہیں۔ دوسرا۔ عثمان نوٹ کرو، بلکہ تیسرا پنجابی والا، نون غنہ کے ساتھ، اوئے سمجھے آئی جے؟ (عثمان نوٹ کرو کی تلمیع کسی معمربزرگ کی جانب تھی جسے بخاری صاحب نجانے کب ملے تھے؟ روایت یہ تھی کہ ان بزرگ کے فرزند اکبر عثمان بھی سفید ریش اور کبر سنی کی منزل میں تھے لیکن بڑے میاں انھیں وہی طفل مکتب گردانتے اور انھیں اسی ڈھب سے خطاب کرتے۔ چنانچہ اگر محفل میں کسی نے کہا کہ میر صاحب وہ ڈپٹی کلکٹر آپ کو پوچھ رہے تھے تو میرصاحب کڑک کر بولے، "صحیح تلفظ ڈسیسیوٹی ہے،عثمان نوٹ کرو!" سمجھ آئی جے، کا قصہ میں نے انھیں سنا تھا اور مجھے خورشید انور نے، بھائی اسلامیہ ہائی اسکول میں کوئی ماسٹر صاحب تھے، جو تختہ سیاہ پر ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے بعد قریب قریب ہمیشہ اپنے طلبا

سے پوچھتے "اوئے سمجھ آئی جے۔" اور لڑکے ہمیشہ جواب میں کہتے، "نہیں جی۔" اس پر ماسٹر صاحب بھنا کر ایک موٹی سے گالی دیتے اور کہتے، "نہیں سمجھ آئی تو جاؤفلاں کی فلاں میں۔" بخاری صاحب سن کر لوٹ پوٹ ہوگئے کہنے لگے "یاراگر اسے یہی کہنا تھا تو پوچھتا ہی کیوں تھا؟" اس کے بعد عثمان نوٹ کرو کے ساتھ "سمجھ آئی جے" بھی ان کی محفل کے روز مرہ میں شامل ہوگیا۔

ان کی فریاد ابھی جاری تھی۔

دیکھو یارو اگر میں تم میں سے کسی کو ٹیلیفون کروں کہ بھائی جان مجھے" ہیضہ ہوگیا ہے، پلیگ کی گلٹی نکل آئی ہے، ڈاکٹر جواب دے گئے ہیں، لبوں پہ دم ہے، للہ آکر منہ دیکھ جاؤ تو سو فیصدی یہی جواب ملے گا کہ موٹر میں ".....آکر لے جاؤ

ہمارے پاس موٹر موجود نہیں ہے"۔ تاثیر نے آہستہ سے کہا۔"

جی ہاں اور آپ ہر روز کالج تو میری ہی موٹر پر تشریف لے جاتے ہیں اور" دن بھر جہاں جہاں بھی آپ حضرات جھک مارا کرتے ہیں، اس خاکسار ہی کے ساتھ تو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تم سب نہایت برے دوست ہو، کاہل، بے قاعدہ، بے سلیقہ، اگر میں اس شہر میں نہ ہوں تو تم مہینوں ایک دوسرے کی صورت "بھی نہ دیکھو۔

اور یہی ہوا بھی "ان کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہوگیا" ادھر بخاری صاحب لندن اور میکسیکو روانہ ہوئے ادھر یہ بساط الٹ گئی۔ ان کی محفل شبینہ کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر کبھی یکجانہ ہو سکا۔ ۴۹ء میں وہ مختصر سے عرصے کے لئے لاہور لوٹے تو یہاں کی صورت احوال سے بہت رنجیدہ ہوئے۔ کہنے لگے "یار تم لوگوں نے سب چوپٹ کردیا ہے، اب ہم جائیت ہیں " اور "اس کے بعد ایسے گئے کہ اپنی مٹی بھی پردیس ہی کو سونپ دی۔

بخاری صاحب کی شخصیت کا ہلکا سا نقش بھی قلم کی گرفت میں کب آتا ہے، یہ کام تو انھیں کے کرنے کا تھا۔ ہاں انھیں یاد کرنے بیٹھا ہوں تو یہی تندہی، مستعدی، قاعدہ اور سلیقہ طرح طرح سے یاد آتے ہیں۔ خوش وقتی کے لئے احباب کی محفل کا اہتمام تو شادی ایسی بڑی بات نہیں۔ اگرچہ ہم سے بیشتر اتنا بھی نہیں کرتے اور بخاری صاحب ایسی تندہی سے تو کوئی بھی نہیں کرتا لیکن وہ تو جو کچھ کرتے ایسے ہی ڈوب کرتے تھے۔ دفتر ہو یا گھر، تحریر ہو یا گفتگو ، دقیق علمی بحث ہو یا ہلڑ بازی۔

مغنی نے غزل شروع کی:۔

کجوائی دو چشمت بلا نشستہ

چوں قبیلہ گرد لیلا ٰی ہمہ جابجانشستہ

تو اسی مطلع پر سحر ہوگئی، قوال اس شعر پر پہنچے۔

صد چاک شدہ سینہ وصد پارہ شدہ دل
دیں بےخبراں جامہ دریدن نگزارند
تو گھنٹوں وارفتگی کا عالم رہا۔ کوئی شعر، کوئی مصرع، کوئی ترکیب، کسی محراب کا خم، کسی کتبے کاخط ،کسی خوانچے والے کی آواز، کوئی محاورہ، کوئی گالی جہاں بھی دل کو وجدوامتزاز کا ذرا سا اشارہ ملا، اپنا واردات میں سبھی کو شریک کرلیا۔
دہلی کی جلتی ہوئی دوپہر میں کبھی بھٹک کر گھٹا آگئی تو جنگ عظیم، ہٹلر اور مسولینی، آل انڈیا ریڈیو، دولت مشترکہ انگلشیہ اور ایسے سبھی دفاتر یک لخت بے معین ہوگئے۔ دوستوں کے افسروں کو ٹیلیفون ہوئے کہ ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو فلاں فلاں ثاحب سے بہت اہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بھاگم بھاگ پہنچے۔ بخاری صاحب دفتر میں دربار لگائے بیٹھے ہیں۔ آغا حمید، سید رشید احمد، غلام عباس، یا ایک آدھ اور، تاثیر پہنچے، مجید ملک آئے۔ میں گیا، بخاری صاحب کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آئیے آئیے"، آپ کانفرنس کرنے آئے ہیں؟ تو کرو، اور سب پر اسکول سے" بھاگے ہوئے بچوں کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ دن بھر قطب میں گزارا، شام کو جامع مسجد کی دیوار تلے کباب کھائے، ایک قطعی غیر معزز محلے میں پان خریدے، آدھی رات تک انڈیا گیٹ کے سامنے بیٹھ کر بیت بازی کی پھر کناٹ پلیس کے جس قہوہ خانہ کا درکھلا پایا وہاں سے ملک شیک پیا، اور وہیں کناٹ پلیس کے میدان میں غالب اور نظیری، حافظ اور سعدی، اقبال اور گوئٹے، ہاپکنز اور ڈلن ٹامس کے محاسن و معائب کے بارےمیں کچھ بھی طے نہ ہو پایا کہ مرغ آاذانیں دینے لگے۔ میں نے کہا "ہمارے ہاں چلئے چائے پئیں گے" بخاری صاحب بولے، "ہرگز نہیں، ایک اصول یاد رکھو، آدمی رات چاہے "!کہیں گزارے لیکن صبح ہمیشہ اپنے بستر سے اٹھنا چاہیے، عثمان نوٹ کرو خیر یہ قصے تو ان کی اپنی دلچسپیوں سے متعلق ہیں لیکن دوستی میں ان کی متعدی اور سلیقے کے ہزار گونہ مظاہراور بھی تھے۔ ایک رات میرے ہاں محفل عین عروج پر تھی۔ تاثیر مرحوم، حسرت مرحوم، صوفی تبسم، عابد علی عابد، آغا بشیر احمد اوربخاری صاحب۔ حسرت صاحب نے انہی دنوں اپنا عجیب و غریب عربی گانا ایجاد کیا تھا اور فلک شگاف آواز میں نظیری کی کسی غزل پر کسی عربی دھن کی چھری چلارہے تھے۔اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ہمارے رپورٹر میاں شفیع ٹیلیفون پر تھے۔ کہنے لگے، ابھی ابھی ایک ٹیلیفون اپریٹر نے گورنمنٹ ہاوس سے ٹیلیفون ملاتے میں نے سنا ہے کہ قائد اعظم فوت ہوگئے ہیں۔ دفتر پہنچ کر ہزار جگے سے خبر کی تصدی چاہی لیکن کسی نے کچھ بتا کر نہ دیا۔ میں نے طے کیا کہ پاکستان ٹائمز اور امروز کے ضمیمے بہرحال تیار کرلئے جائیں۔ ممکن ہے رات میں کسی وقت

کوئی اطلاع پہنچ جائے۔ میں اداریہ لکھنے بیٹھا، تو بخاری صاحب مرحوم کے سوانح حیات مرتب کرنے لگے۔ صوفی صاحب قطعہ تاریخ کو فکر کرنے لگے۔ تاثیر مرحوم اور حسرت مرحوم امروز کی ترتیب میں مصروف ہوگئے۔ میں نے رات بھی کام کیا۔ تین بجے کے قریب خبر کی تصدیق ہوئی اور جب ہم دفتر سے نکلے تو پوپھٹ چکی تھی۔اور سیر خیز لوگ کاروبار یا کوئے یا رکارخ کئے گھروں سے روانہ ہوچکے تھے۔ بخاری صاحب کو صحافت یا خالص سیاسی کاروبار سے لگاؤ نہ تھا۔ لیکن انھوں نے اسی ڈھب سے کئی راتیں پاکستان ٹائمز کے دفتر اور چھاپے خانے میں بسر کیں۔ گاندھی جی کے قتل کی رات، پریس میں نئی روٹری مشین چالو ہونے کی رات، ۱۳/۱۴اگست کی درمیان رات، اب شاید بتادینے میں بھی مضائقہ نہیں کہ اس زمانے کے پاکستان ٹائمز کے تین یا چار اداریے اور مختلف ناموں سے بہت سے مراسلے بخاری صاحب کے قلم سے ہیں مراسلوں کے کالم میں ایک پرلطف بحث مجھے خاص طور سے یاد ہے جو ہفتوں چلتی ہے اس کا سہرااور اصل ان حقیقی یا فرضی بزرگ کے سر ہے جو مولوی قینچی کے نام سے مشہور تھے۔ اور بقول خلق مر بے نقاب خاتون کی چٹیا پر دست درازی کی فکر میں رہتے تھے۔ ایسے دو چار واقعات سننے میں آئے تو بخاری صاحب نے مولوی صاحب کی خدمت اور "Mere Woman" بے نقاب خواتین کی حمایت میں ایک بہت موثر مراسلہ کے نام سے لکھا۔ اس پر آزادی نسواں کے حامیوں اور مخالفین میں بہت زوروں کی بحث چلی اور جب تک چلتی رہی بخاری صاحب ان میں سے بیشتر خطوط کی تصحیح و ترتیب پاکستان ٹائمز کے دفتر میں بیٹھ کر خود کرتے رہے۔ انھیں بچوں سے خاص رغبت نہ تھی "چھوڑو یار، عورتوں کا محکمہ ہے۔" لیکن قریب قریب ہر چھٹی کے دن ہمارے اور تاثیر صاحب کے بچوں سے "لاج" میں آنکھ مچولی کھیلتے، ان کے لئے نئے نئے کھیل ایجاد کرتے، گیت گاتے اور کہانیاں سناتے۔

وہ بوڑھوں سے اور بھی زیادہ نفور تھے۔ لیکن انہی دنوں لندن سے میری بیوی کے والدین ہمارے ہاں وارد ہوئے تو بخاری صاحب نے ایک ہی ملاقات میں انہیں بھی رام کرلیا۔ یہ بیچارے اگلے وقتوں کے سیدھے سادھے سفید پوش انگیز لوگ جنھیں بخاری صاحب کے ذہنی مشاغل سے دور دور علاقہ نہ تھا۔ اس شام بخاری صاحب پہنچے تو میں اور میری بیوی دونوں یہ سمجھے کہ آج ان کا رنگ نہ جمے گا اور بات رسمی تکلفات سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔ خیر تعارف اور دو چار ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر بخاری صاحب اچانک بولے "مسز جارج آپ کو پہلی جنگ عظیم کے بعد کا کوئی گانا یاد ہے۔ مثلاً فلاں اور کوئی پرانا انگریزی گیت گنگنانے لگے۔ ہماری خوشدامن کو گانے سے شغف تھا۔ فوراً کھل گئیں اور دو گانوں کیا ایسا تناتا بندھا کہ کسی کو زمان و مکان کی

سدھ نہ رہی۔ یہاں تک کہ دونوں موسیقار ہانپنے لگے۔ یہ ایکٹ ختم ہوا تو بخاری صاحب بڑے میاں سے مخاب ہوئے " مسٹر جارج چھوڑیئے۔ ان عورتوں کا، "چلئے ہم دونوں چلیں۔
کہاں لئے جاتے ہو میرے بڈھے کو۔" مسز جارج پکاریں۔"
Going to paint the townہم عید کرنے جارہے ہیں مسز جارج"
اور رات گئے تک انھیں لاہور کے ریستورانوں میں گھماتے اور اینگلو .red
انڈین لڑکیوں کا رقص دکھاتے رہے۔
لیکن ان سب اداؤں کے باوجود ناآشنا لوگ بخاری لوگ کو بہت ہی کم آمیز بڑا صاحب سمجھتےتھے اور یہ تاثر چنداں غلط بھی نہ تھا۔ عمر بھر کی بے تکلفی کے باوجود ہم میں سے بھی کسی کا یہ حوصلہ نہ تھا کہ ان کے اوقات میں مداخلت کرے یا ان کی فرمائش کے بغیر ان کی کسی مصروفیت میں حارج بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ بخاری صاحب لباس بدلتے ہیں تو ساتھ یہ شخصیت بھی بدل لیتے ہیں۔ دفتر میں اور، گھر میں اور محفل میں اور، اصل میں یوں نہ تھا بلکہ یہ ان کے بہت ہی نپے تلے قاعدے اور سلیقے کا اظہار تھا۔
ایک بار ایک بہت ہی باتکلف لیکن کچھ غیر دلچسپ سے حضرت میرے گھر پر تشریف لائے۔ میں بخاری صاحب کے ہاں جانے کی فکر میں تھا۔ کہنے لگے، بھئی ان سے ملنے کا تو بہت اشتیاق ہے، مجھے بھی لے چلو۔" میں نے کہا چلئے۔ بخاری صاحب کی پیشانی پر انھیں دیکھتے ہی ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔ یہ صاحب پلے تو گم سم بیٹھے رہے۔ پھر ایک آدھ یونہی سی بات کی بخاری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، کہنے لگے، صاحب اس وقت بدقسمتی سے میں مصروف ہوں، معافی چاہتا ہوں، انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ ہم چلنے لگے تو چپکے سے پوچھا "اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟" میں نے کہا دفتر جاؤں گا۔ میں اپنے ساتھی سے رخصت ہوکر دفتر پہنچا تو تھوڑی دیر میں بخاری صاحب بھی آگئے۔ پوچھا یہ کون تھے؟ میں نے بتایا کہ فلاں فلاں تھے بہت بھلے آدمی ہیں۔ کہنے لگے، تکلف میں تضیع اوقات تک تو خیر جائز ہے لیکن تکلف میں بور ہونا کسی صورت بھی جائز نہیں امرتا شیر گل تمہیں یاد ہے؟ کیا غضب کی عورت تھی؟ ایک دفعہ اس کے اعزاز میں یہیں فلیٹیز میں ایک بہت بڑی دعوت تھی۔ بڑا بڑا خان بہادر اور رائے بہار بیٹھا تھا۔ امرتا آکے بیٹھیں، آس پاس کے لوگوں سے کچھ دیر گفتگو کی اور کھانا شروع بھی نہ ہوا تھا کہ اٹھ کھڑی ہوئیں، "میں بور ہوگئی، میں جاتی ہوں۔" میزبان اور مہمان دیکھتے ہی رہ گئے اور وہ کھٹ کھٹ یہ جاوہ جا! اخلاقی جرأت اسے "کہتے ہیں۔ مجھے آج تک اس واقعے سے رشک آتا ہے۔
یہ تو ایک قاعدہ تھا۔ دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ "کام کے وقت ڈٹ کر قاعدے سے کام کرو تاکہ کام کے بعد ڈٹ کر بے قاعدگی کرسکو۔" اور قاعدے کی صورت یہ

تھی کہ آل انڈیا ریڈیو کی پہاڑی سی عمارت اور ہندوستان بھر میں بکھرا ہوا چیونٹیوں کا سا عملہ لیکن اور دفتری کام کے علاوہ اس عمارت کی ہر کھڑکی کے ہر شیشے، ہر دروازے کے ہر قبضے، ہر کمرے کے ہر کونے کی صفائی اور اس عملے کے ہر فرد کی ہر سرکاری و غیر سرکاری حرکت پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اور یہ تو خیر ممکن ہی نہ تھا کہ مستقل ہنگامہ آرائی، کوچہ گردی اور رتجگوں کے باوجود ان کی گاڑی ہر صبح نو بجے سے پانچ منٹ قبل دفتر کی عمارت میں داخل نہ ہو۔
لیکن اس ساری قاعدے بازی میں ساتھ ہی ساتھ ان کی خوش طبع اور اپج بھی کسمساتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ گھر میں آتشدان کے سامنے بہت سی فائلیں لئے بیٹھے ہیں اور فائلوں میں سے کاغذارت نکال کر آگ میں جھونکے جارہے ہیں۔
یہ کیا ہورہاہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔"
بات یہ"Quick Disposal" دیکھو، اس کو انگریزی زبان میں کہتے ہیں۔" ہے کہ ان سب فائلوں میں محض خرافات بھری ہے اور اس خرافت سے چھٹکارا پانے کی واحد صورت یہی ہے کہ اس کا نام و نشان صفحہٗ دفترسرکار عالی مدار سے محور کردیا۔" یہ دوسری بات ہے کہ اس نوع کی خرافات وہ خود ہی ایجاد بھی کرتے رہتے تھے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں وہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے استاد بھی تھے اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سیکرٹری بھی۔ ایک دن ہم دو تین دوست کسی کام سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے دفتر گئے۔ بخاری صاحب نے دیکھا تو اپنے کمرے میں بلالیا۔ کہنے لگے "تمہیں معلوم ہے اس دفتر میں کیا کام ہوتا ہے، یہ دیکھو۔" اور کاغذات میں سے ایک کافی ضخیم فائل نکالی جس کے سرورق پہ لکھاتھا یعنی دفتر کی بلی۔ یہ کون سی درسی کتاب ہے۔ ہم نے "Office Cat" پوچھا۔ "بولے،" قصہ یوں ہے کہ ایک دن میرے کمرے میں ایک بلی آگئی۔ مجھے اچھی لگی۔ میں نے کسی سے کہا اسے تھوڑا سا دودھ لادو۔ پھر وہ بلی ہر روز آنے لگی اور ہر روز اسے دودھ بھی ملنے لگا۔ مہینے کے آخر میں سپر نٹنڈنٹ صاحب نے دفتر کے اخراجات کا بل مجھے بھیجا تو اسکے ساتھ ایک تحریری سوال یہ بھی منسلک تھا کہ بلی کے دودھ پر چودہ روپے ساڑھے چھ آنے کی رقم صرف ہوئی ہے وہ کس مد میں جائیگی؟ میں نے لکھ بھیجا یعنی متفرق خرچ میں ڈال دو۔ تھوڑے دنوں کے بعد "Contingency" اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر نے بل لوٹا دیا اور یہ تحریری فہمائش کی کہ کی حد دفتر کے ساز وسامان اور دیگر غیر جانبدار اشیا "Contingency" کے لئے مخصوص ہے۔ بلی جاندار شے ہے اور اس کے اخراجات میں شامل نہیں کئے جاسکتے۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ "Contingency"

صاحب نے مجھ سے مزید تحریری ہدایت طلب کی۔ میں نے لکھا کہ جاندار غیر یعنی عملے کی مد میں "Establishment" جاندار کا قصہ ہے تو یہ خرچ ڈال دو۔ دوبارہ بل خزانے کو روانہ ہوا اور تھوڑے دنوں میں لوٹ آیا۔ اب کے ایک کافی طویل مراسلے میں یہ استفسارات تھے کہ اگر یہ خرچ عملے کی مد میں جائے گا تو واضع کیا جائے کہ اس رقم کو تنخواہ تصور کیا جائے یا کہ الاؤنس؟ اگر تنخواہ ہے تو بموجب قاعدہ نمبر فلاں فلاں دفتر کی پیشگی منظوری درکار ہے اور اگر یہ الاؤنس ہے تو بموجب قاعدہ فلاں فلاں افسر سے اس کی تصدیق لازمی ہے ..... چنانچہ یہ فائل چھ مہینے سے چل رہی ہے اور اس میں ایسے ایسے نازک اور باریک نکتے بیان ہوئے ہیں کہ اندازہ نہیں۔" ..... سنو، یہ ٹیکسٹ بک کمیٹی، پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور۔ کہنے لگے "سنو، یہ پہلا خط ہے۔
ازجانب پروفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور، بنام پروفیسر اے ایس بخاری شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور۔
!جناب والا
آپ کی یاد دہانی کے لئے عرض ہے کہ گزشتہ ماہ آپ کو پانچ کتابیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ریویو کی غرض سے ارسال کی گئی تھیں۔ لیکن ریویو ابھی تک موصول نہیں ہوئے۔ مہربانی سے جلد توجہ فرمائیے۔
آپ کا نیاز مند:۔ اے۔ایس۔بخاری

اس کے بعد یادہانی کے دو خط اور ہیں۔ اور تیسرا خط یہ ہے۔
از جناب پرورفیسر اے ایس بخاری سیکرٹری ٹیکسٹ بک کمیٹی لاہور، بنام پروفیسر اے ایسی بخاری شعبۂ انگریزی گورنمنٹ کالج۔ لاہور۔
!جناب والا
بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں، آپ کو ٹیکسٹ کمیٹی کی طرف سے جو پانچ کتابویں ارسال کی گئی تھی (تفصیل درج ذیل ہے) ان میں سے تین کے ریویو وصول ہوگئے ہیں جس کے لئےکمیٹی آپ کی ممنون ہے، لیکن کمیٹی توجہ دلانا چاہتی ہے کہ انتہائی اصرار کے باوجود آپ نے دو کتابوں (یعنی فلاں اور فلاں کتاب) کے بارے میں ابھی تک اپنی رائے تحریر نہیں فرمائی۔ کہ کمیٹی اس تاخیر کر وجوہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ آپ کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ اگرت فلاں تاریخ تک آپ کی رائے وصول نہ ہوئی تو آپ کا نام ریویو کرنے والوں کا فہرست میں سے خارج کردیا جائیگا۔ آپ کا نیاز مند:۔ اے ایس بخاری

اور کا جواب یہ ہے، منجانب اے ایس بخاری وغیرہ بنام اے ایسی بخاری وغیرہ جناب والا! بحوالہ خط نمبر فلاں فلاں، بقیہ ریویو ملفوف ہیں۔ میں یہ گوش گزار

کئے بغیر رہ نہیں رہ سکتا کہ آپ کے خط کا آخری پیرا گراف انتہائی قابل افسروں سے خطاب کا یہ انداز قطعی غیر (Senior) اعتراض ہے۔ سینئر موزوں ہے۔ آپ کا نیاز مند:۔ اے ایس بخاری

پھر بخاری صاحب نے فائلیں اور کاغذات سمیٹے اور بولے "اچھا اب تم فوراً "رفوچکر ہوجاؤ، مجھے بہت کام ہے۔
لیکن یہ سب کچھ تو صرف بخاری صاحب کی باتیں ہیں، بخاری تو نہیں ہیں۔ وہ عالم بھی تھے، ادیب بھی، استاد بھی، مم جلیس بھی، بذلہ سنج بھی، خود تحریر بھی، سخت گیر منظم بھی، بے فکر بانکے بھی اور آخر میں مدبر اور صاحب سیاست بھی۔ لیکن یہ سب صفات گنوادینے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا بنیادی پہلو تو یہ ہے کہ ان کا کوئی بھی لمحہ بے مقصد اوربے مصرف نہیں گزرا اور ان میں سے بیشتر لمحات موجودات کے ہر مظہر سے خوبی اور حسن اور انبساط کے اخذ و استفادہ میں گزرے اور وہ قلب و نظر کی اس دولت کو عمر بھر محفلوں، دانشکدوں، ایوانوں اور گزرگاہوں میں یوں بکھیرتے رہے کہ اپنے نام کی یادگار کے لئے اس کا عشرعشیر بھی نہ بچا۔ مجھے اس دور کی کوئی ایسی شخصیت معلوم نہیں جس نے اپنے بہت سے لوگوں ے لئے اس قدر لطف و مسرت دریافت اور تخلیق کی ہو۔ وہ سب لوگ جن کے دوسرے اہل کمال گفتار و تحریر کی کیسی بھی نعمتیں معیا کریں۔ یہی فریاد کریں گے:۔

"عشوہ ٔ زاں لب شیرین شکربازبیار"

* * *

بھائی بھائی

سید ذوالفقار علی بخاری

سید ذوالفقار علی بخاری اپنے برادر محترم سید احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم کی موت کے بعد ان تمام یادوں کو جو اُن سے وابستہ ہیں "بھائی بھائی" کے نام سے ایک کتابی صورت میں یکجا کر رہے ہیں اور اس طرح اپنے اس سراپا زندگی بھائی کو موت کے بےرحم ہاتھوں سے چھین کر اپنے لیے زندہ رکھنا چاہتے ہیں جن کی موت کا یقین کرلینے کے بعد زندگی کا اعتبار اور بھی اُٹھ جاتا ہے۔

سید ذوالفقار علی بخاری کی اس کتاب کا ابھی بچپن ہے مگر اسی دور کے چند اقتباس میں نے اس لیے حاصل کرلیے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ اندازہ ہوسکے کہ سب کا پطرس خود اپنے بھائی کے لیے کیا تھا۔

میں جناب علامہ عباس کا ممنون ہوں کہ ان کی وساطت سے مجھ کو یہ اقتباس نقوش کے لیے حاصل ہوسکے اور طفیل صاحب سے سرخروئی ہوئی۔

(شوکت تھانوی)

* * *

بھائی جان اسکول میں پڑھتے تھے اور میں ابھی اسکول میں داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ والد گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ میری والدہ سے کہا مبارک ہو کل پیر احمد شاہ کو اسکول میں انعام ملے گا"۔

بھائی گھر آئے تو میں نے کہا " لالہ اسکول میں مار پٹتی ہے یا انعام ملتا ہے"۔

پھر رات بھر ہم دنوں بھائی جاگتے رہے۔ وہ مجھے اسکول کے قصے سناتے رہے اور میں سنتا رہا۔ مجھ سے کہنے لگے "تم بڑے ہوتے تو میں تم کو کل ساتھ لے جاتا"۔

میں رو پڑا۔ انہوں نے مجھے اُٹھ کر پیار کیا اور کہا۔ "اچھا دیکھو کل میں تمہاری شلوار پہن کر انعام لینے جاؤں گا"۔

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور ہنسی خوشی سو گیا۔ اگلے دن وہ میری

شلوار پہن کر انعام لینے کے لیے گئے۔ ان کو کچھ کتابیں انعام میں ملی تھیں۔ جن پر سرخ رنگ کا دفتری فلیتہ بندھا ہوا تھا۔ کئی دن تک وہ فلیتہ میرے پاس رہا اور میں محلے کے لڑکوں کو دکھاتا رہا۔

میں اسکول میں داخل ہوگیا۔ بھائی جان کے ساتھ اسکول جانے لگا۔ میرے ماتھ پاؤں کچھ ڈھیلے ڈھیلے تھے۔ کبھی بغل میں سے بستہ سرک جائے کبھی تختی پھسل جائے۔ کبھی میں گر پڑوں۔ چنانچہ بھائی میرا بستہ خود اٹھا لیتے اور انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ چلاتے۔

جب میں نے سڑک پر جم کر پاؤں رکھنا سیکھ لیا تو بھائی جان نے اپنا بوجھ مجھ پر لادنا شروع کردیا۔ اب ان کا بستہ میں اٹھا کر لے جاتا تھا۔ کبھی ان کو اسکول جاتے ہوئے کچھ اور لڑکے مل جاتے تو یہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے۔ میں رو پڑتا اور روتے روتے اسکول پہنچتا۔

اسکول میں سالانہ جلسہ ہوا۔ اس وقت ہمارے صوبہ کے چیف کمشنر سرجارج روس کیپل تھے اور وہی جلسے کے صدر تھے۔ شہر کے تمام رؤسا اور حکام جلسے میں شریک تھے۔ ہمارے والد بھی تشریف رکھتے تھے۔

اسکول کے کئی لڑکوں نے نظمیں پڑھیں۔ بھائی جان نے بھی انگریزی میں ایک نظم پڑھی ان کی خواندگی کی بہت داد دی گئی۔ سرجارج روس کیپل بھی بہت خوش ہوئے۔

جلسہ ختم ہوگیا اور لوگ ٹولیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے یا ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ بھائی جان اور میں والد کے پاس کھڑے تھے۔ لوگ والد کو مبارکباد دے رہے تھے اور بھائی جان کو پیار کررہے تھے کہ اتنے میں بھائی جان کے لیے ڈھنڈیا پڑی۔ ہمارے ایک ماسٹر صاحب بھاگتے ہوئے آئے

اور کہا "چلو پیراحمد لاٹ صاحب بلا رہے ہیں"۔

میں بھائی جان کو لیئے ہوئے جلدی جلدی وہیں جمگھٹے میں پہنچا جس کے بیچ میں سرجارج روس کیپل کھڑے تھے۔ والد آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے آنے لگے۔ جب سرجارج روس کیپل نے بھائی جان کو دیکھا تو آگے بڑھے اور بھائی جان کے کندھے پر ماتھ رکھ کر انگریزی میں کہا۔ "تم نے نظم بہت اچھی طرح پڑھی۔ تمہارا لہجہ بھی اچھا ہے اور تلفظ بھی۔ شاباش"۔

اتنے میں والد بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ سرجارج روس کیپل نے میرے والد سے مصافحہ کیا اور بھائی جان کے متعلق تعریفی جملے پشتو میں کہے۔ والد نے کہا"صاحب جو لفظ کہہ رہے ہو یہیں لکھ دو تاکہ یہ لڑکا تمام عمر تمہارے کہے کی لاج رکھے"

سرجارج نے بھائی کی بغل سے انعام کی کتابوں کے بنڈل میں سے ایک

کتاب کی جلد کے اندر کی طرف پنسل سے یہ الفاظ لکھے "اےکاش میں پشتو اتنی اچھی طرح بولنے لگوں جتنی اچھی طرح چھوٹا پیر۔ پیر احمد شاہ انگریزی بولتا ہے"۔
یہ سند بہت مدت تک والد نے سنبھال کر رکھی تھی۔ اگلے دن صوبہ سرحد کے واحد اخبار 'افغان' میں اس سند کی کہانی شائع ہوئی۔ عنوان تھا:

"چھوٹا پیر -- پیراحمد شاہ"

بھائی بڑے ہوتے گئے اور ہر سال اسکول میں انعام پاتے رہے-- میں بھی پانچویں سوار کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ہمارے ایک بڑے بھائی تھے۔ پیر محمد شاہ، اللہ انہیں غریق رحمت کرے، بہت تیز مزاج بزرگ تھے۔ ہم دونوں کو ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ لیکن کئی باتوں میں ہم ان کی پیروی بھی کرتے تھے۔ مثلاً ان کو انگریزی ڈھب کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ ہم کو بھی یہ شوق لاحق ہوا۔ وہ شعر کہتے تھے اس لئے والد کے منظور نظر تھے۔ ہم دونوں نے بھی شعر کی طرف توجہ کی۔ جب ہماری شعر گوئی کی خبر بڑے بھائی تک پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوئے اور والد نے بھی اس بات کو نہ سراہا کہ ہم اسکول کا کام چھوڑ کر شعروشاعری میں پڑ جائیں۔ خود والد شعر کہتے تھے۔ لیکن بچوں میں سے کسی اور کا شعروشاعری کی طر ف متوجہ ہونا شروع شروع میں انہیں پسند نہ آتا تھا۔ بھائی شعر کہتے مگر انہیں فضول سمجھ کر پھاڑ دیتے۔ میں شعر کہتا اور فضول بھی کہتا تو لوگوں کو سناتا۔ میں نے بہت سے تخلص رکھے۔ اثر۔ ذوالفقار۔ واجدان، مگر ان میں سے کوئی نہ مجھے پسند آیا نہ میرے بھائی کو۔ ایک دن جب اس تخلص کا جھگڑا د ر پیش تھا تو کہنے لگے تخلص کیوں ضروری ہے۔ میں نے کہا مقطع کے لیے۔ پھر کہا مقطع کیوں ضروری ہے، میں نے کہا تاکہ معلوم ہو کہ غزل کسی کی ہے اور باقی شعر۔ میں چپ ہوگیا اور تخلص رکھنے کا خیال دل سے نکال دیا۔
ایف اے پاس کرنے کے بعد بھائی جان گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوگئے اور ان کے خط آنے لگے۔ ایک خط میں بھائی نے مجھے لکھا کہ میں نے یہاں راجا غضنفر علی خان اور پنڈت اوتار لال بقایا کودوست بنایا ہے۔ راجہ غضنفر علی خان تو بہت بے سرے ہیں لیکن پنڈت اوتار لال بہت خود گاتے ہیں اور باجا بھی بجاتے ہیں۔ میں نے بانسری بجانی سیکھ لی ہے اور ان کے باجے کے ساتھ بانسری بجاتا ہوں۔ بھائی نے مجھے تاکید کی کہ اس بات کو صرف اپنے تک رکھوں۔

* * *

گورستان ادب کا فقیر

عبدالمجیدسالک

مسلم ٹاؤن لاہور

مکرمی ۔ السلام علیکم

آپ کے دو تین خط ملے لیکن میں کسی ایک کا بھی جواب نہ لکھ سکا۔ حالانکہ یہ کوتاہی میری وضع کے خلاف ہے۔ بخاری کا مرنا، میری محفل احباب کا قطعی طور پر اجڑ جانا ہے زندگی بالکل بےمزہ وبےرنگ ہوکر رہ گئی ہے۔

آپ کو غالباً معلوم نہیں، میں کوئی سال بھرسے عوارض قلب میں مبتلا ہوں، لکھنا پڑھنا چھوٹ چکا ہے۔ مرکھپ کر ایک آدھ نشری تقریر ہفتہ میں لکھ لیتا ہوں اور بس۔ آج کل بھی بلڈپریشر میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر محمد یوسف معینوں سے علاج کررہے ہیں۔ آپ مجھ سے مضمون کی فرمائش کرتے ہیں تو بےحد شرمندہ ہوتا ہوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ تعمیل حکم کرسکوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو شاید کچھ لکھدوں نہ ہوا تو معذور جان کر معاف فرمادیجیئے گا۔

عبدالمجیدسالک

مولانا عبدالمجیدسالک کا یہ خط مجھے ۱۳ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ملا تھا۔ مگر اس عرصے میں مولانا موصوف کی صحت اور بگڑی اور کہ ہم لوگ دم سادھ کے رہ گئے۔ مضمون لکھوانا تو درکنار، ہمیں اپنی زندگی، ان کے حساب میں جمع کرانا پڑی۔ تب کہیں انہیں دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

ابھی دوچار روز کی بات ہے کہ میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ خیال تھا کہ اگر ان کی صحت اچھی ہوئی تو پطرس پر لکھنے کے لیے کچھ عرض کروں گا۔ انہیں دیکھا تو کچھ کہا نہ گیا۔ دل کی دل ہی میں لے کر واپس آگیا۔
بخاری صاحب کے جتنے گہرے تعلقات عبدالمجیدسالک سے تھے اتنے اور کسی

سے نہ تھے۔ دین تھے تو یہ، دنیا تھے تو یہ، دوست تھے تو یہ، بھائی تھے تو یہ، مشیر تھے تو یہ، استاد تھے تو یہ، گویاسب کچھ بخاری صاحب کے لیے سالک صاحب تھے۔

بیماری نے انھیں اس حد تک نڈھال کردیا ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے وہ پطرس کے لیے کچھ نہیں لکھ سکتے حالانکہ اتنا کچھ لکھناچاہتے ہیں کہ آپ پڑھ پڑھ کر خوش ہوں اور یہ لکھ لکھ کر۔

مجبوری کے عالم میں مولانا موصوف کی دو چھوٹی چھوٹی تحریریں پیش کر رہے ہیں۔ ایک تو بخاری کی وفات پر، ریڈیو پر ان کا پیغام ہے، دوسری ایک اور مطبوعہ تحریر جس میں پطرس بھی ہے اور مجید بھی۔

(محمد طفیل)

۱

احمد شاہ بخاری کی موت پاکستان میں علم وادب اور خلوص ومحبت کی موت ہے۔ اس کے دوست اشکبار ہیں اور پورا ملک ناقابل تلافی نقصان پر ششدرو مبہوت ہورہا ہے۔ اس بےنظیر قابلیت کے افراد ہمارے ملک میں نایاب ہیں جو زندگی کی ہر مصروفیت میں اپنے اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آئیں۔ بخاری صاحب گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر کی حیثیت سے، آل انڈیا ریڈیو کے ڈائیریکٹر جنرل کی حیثیت سے، پھر اپنے کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے، اس کے بعد اقوام متحدہ میں پاکستان وفد کے رئیس کی حیثیت سے، جہاں کہیں بھی رہےسربلند وممتاز اور نمایاں رہے۔ وہ ادب وانشاء، طنزومزاح اور تنقید عالیہ میں دور دور تک اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پورے برصغیر میں بخاری کے بیسیوں شاگرد اپنی اپنی حکومتوں کے اعلٰی عہدوں پر ممتاز ہیں اور بہترین خدمات بجا لا کر اپنے عالی قدر استاد کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بخاری نے ادب وانشاء میں بہت قلیل سرمایہ چھوڑا ہے لیکن اس کے قلم سے جو چند تنقیدی مضامین اور جو ایک دو کتابیں نکلیں، وہ ہمیشہ ہمارے ادیبوں اور نقادوں کوصحیح الخیالی اور بالغ نظری کا سبق دیتی رہیں گی۔ اور پاکستان ہمیشہ اپنے اس عدی المثال اور عالی دماغ فرزند پر ناز کرتا رہے گا۔

* * *

۲

جن دنوں میں کراچی میں مقیم تھا۔ بخاری مرحوم پاکستان آئے تو چند روز کراچی میں فروکش رہے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہیے کوئی نیا

دوست بھی بنایا۔ میں نے کہا کیسی باتیں کرتے ہو، کبھی دوست بھی بنائے جاتے ہیں اور خصوصاً اس عمر میں؟ دوست تو جوانی میں میسر آتےہیں۔ اور خودبخود بن جاتے ہیں۔ البتہ بعض مخلص نوجوان زندگی کے ہر حصے میں ملتے ہیں جن کے خلوص پر جان قربان کردینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً تم نے مجید لاہوری کا نام سنا ہوگا؟ کراچی میں یہ شخص میرا تنہا رفیق اور دوست ہے۔ اسے عالم اور ادیب ہونے کا دعو 'ی نہیں لیکن طبیعت کی جودت کی وجہ سے اچھے اچھے عالم اور ادیب اس کی قدر کرتے ہیں۔ کہنے لگے تو پھر ہم سے اس کی ملاقات ضرور کرادیجیئے۔

ایک دن میں مجید کو لے کر برسٹل ہوٹل کے پا س بخاری کے ہاں گیا۔ "جنگ" کا "حرف وحکایت" تو پڑھتے ہی تھے۔ اب اس کے مصنف کو دیکھا تو بےحد نہال ہوئے اور جب باتیں سنیں تو اور بھی زیادہ فریفتہ ہوئے۔ مجید کی بھولی بھالی صورت، اس کے بےضرر تفنن اور مخلصانہ سادگی کی وجہ سے پہلی ہی ملاقات میں اس سے یوں پیار کرنے لگے جیسے برسوں کی شناسائی ہو، مجید کی نظمیں سنیں تو اور بھی لٹو ہوئے۔ اس کے بعد قرار پایا کہ ہر روز رات کے وقت کھانے کے بعد سالک کے مکان پر "خلوت اُنس" برپا ہوا کرے۔ جس میں بخاری اور مجید کے سوا کوئی نہ ہوا۔ چنانچہ عقب ریڈیو اسٹیشن والے مکان میں یہ نشست باقاعدہ منعقد ہونے لگی۔ خشک پھل کی پلیٹیں تپائیوں پر پڑی ہوتیں۔ چلغوزوں کا انبار موجود ہوتا اور نمکین اور گرماگرم کشمیری چائے کے بھرے ہوئے تھرمس تیار رہتے۔ بخاری، مجید اور میں چائے کی چسکیاں لیتے، چلغوزے کھاتے اور غزلیں پڑھتے۔ یہ صحبت بعض اوقات دو دو بجے رات کو ختم ہوتی۔

ان صحبتوں میں مجید کراچی کی سیاسیات، پاکستان کے بعض اکابر کی خصوصیات اور بعض ادبی، مجلسی اور اقتصادی (یعنی تجارتی) شخصیتوں کے لطیفے اپنے مخصوص انداز میں سناتا۔ بخاری بےحد شگفتہ ہوتے۔ اور اقوام متحدہ اور امریکہ کے واقعات کی جگالی کرتے۔ اور پرانی یادوں سے اپنے خزاں رسیدہ دور زندگی کی ویرانیوں کو لالہ زار بناتے اور پھر جب رات بوڑھی ہونے لگتی تو بخاری مجید کو اپنے موٹرکار میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچاتے اور پھر اپنے گھر جاتے۔

جب تک مجید زندہ رہے بخاری پر والہ شیفتہ رہے اور بخاری بھی نیویارک سے جب کوئی خط مجھے لکھتے، مجید کا حال ضرور پوچھتے، اور 'نمک دان' بھیجنے کا تقاضا کرتے چنانچہ ہم "نمک دان" کے پرچے جمع کرکے وزارت

خارجہ کے ذریعے "ڈپلومیٹک بیگ" میں بخاری کو ارسال کردیتے۔

مجید کے انتقال پر بخاری اس قدر غمزدہ ہوئے کہ ان کا تعزیتی خط جو
میرے نام آیا خود روتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

ابھی حسرت ومجید کا ماتم ختم نہ ہونے پایا تھاکہ ہم لوگوں کو بخاری جیسے
عظیم الشان دوست اور عظیم الشان انسان کے فقدان پر سینہ کوبی کرنی پڑی۔
میں تو محسوس کرتا ہوں کہ گویا گورستان ادب کا فقیر ہوں جنازے دھڑادھڑ
آرہے ہیں یہاں تک کہ انہیں دفن کرتے کرتے تھک گیا ہوں چاروں طرف نظریں
ڈالتاہوں تو تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔

زندگی کی شاہراہ حوادث کے آفتاب کی تمازت سے تپ رہی ہے۔آہ! اے موت
کی سایہ دار سرزمین! تو کہاں ہے؟ کہ راہ حیات کے مسافر تیری ٹھنڈی چھاؤں
میں آرام پاسکیں اور ان گئے گذروں سے جاملیں جو اپنی خوش نصیبی کی وجہ
سے اس تیرہ خاکدان سے نجات پا کر جاچکے ہیں۔

یاریان موافق ہمہ اردست شدند
ازدست اجل یگاں یگاں پست شدند

بودندتنک شراب درمجلس عمر
یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

***

میرا نام بخاری ہے

بی۔ اے۔ ہاشمی

کسی نے دروازے پر دستک دی۔
"آجائیے۔"
"السلام علیکم۔۔۔ امتیاز میں؟"
"کمرہ آپ کے سامنے ہے دیکھ لیجئے۔"
نمایاں طور مسکراتے ہوئے "میرا نام بخاری ہے امتیاز نے کہا تھا کہ وہ آپ کے پاس آئیں گے تو ابھی تک نہیں پہونچے۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کرلوں۔"
"بسم اللہ۔"
یوں میری اور بخاری صاحب کی ۱۹۳۰ء میں پہلی ملاقات ہوئی۔
بخاری صاحب بیٹھ گئے۔اِدھر اُدھر کی رسمی باتیں کرتے رہے پھر دہلی شہر گفتگو کا موضوع بن گیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک دہلی کے آثارقدیمہ سے لے کر کارخانہ داروں کے طورطریق اور رہن سہن کی باتیں ہوتی رہیں۔ سورج ڈھل گیا۔ مغرب کی اذانیں ہونے لگیں۔ بخاری صاحب بولے۔ امتیاز نہیں آئے میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔ زبان پر یہ لفظ تھے لیکن چہرے پر شادابی کہ اچھا کیا تیرا وقت ضائع کیا۔ پھر بولے آپ شام کو ٹہلنے نہیں جاتے۔ میں نے کہا التزاماً اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں۔ جی چاہے تو چلیے۔ یوں بخاری صاحب اور میں ٹہلنے نکلے جوپھر مہینوں لیکن بےقاعدگی سے جاری رہا۔
آٹھ بجے کے لگ بھگ واپس آئے تو پھر میرے کمرے میں۔ ملازم نے کہا میاں کھانا لے آؤں۔ میں نے کہا ہاں۔ اپنی کرسی پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے فضا کو مخاطب بنا کر بخاری صاحب بولے اب چلنا چاہیئے۔ میں نے عرض کیا دال روٹی یہیں کھا لیجیے۔ انڈوں اور دہی کے اضافے کے بعد کھانا آیا۔ ہم دونوں نے معمولی اور مختصر کھانے کو آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں ختم کیا۔
ساڑھے نو کے قریب بخاری صاحب بولے۔ اچھا بھائی میں چلا۔ میں گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کواڈرنیگل میں رہتا ہوں۔ میں بھی ہمراہی کے لیے ان کے ساتھ ہولیا۔ اور نیلے گنبد کے چوک سے واپس آگیا۔

اس کے بعد کم وبیش بلاناغہ شام کی ملاقاتوں کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔
ہمارے ایک مشترکہ دوست کوبخاری صاحب کااس باقاعدگی سے میرے پاس تشریف لانا کچھ گراں گذرا۔ ایک دن وہ بولے کہ دیکھو بخاری! باوجود دیرینہ رسم کے تم میرے پاس نہیں آتے اور ہاشمی کے پاس روز آتے ہو، بخاری صاحب نے جواب دیا ملک صاحب یہ دل ملنے کے سودے ہیں۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں روز حاضر ہوں تو میرے آنے کی ٹیوشن بلکہ 'وزیٹنگ فی' مقرر کردیجیے۔ سو روپیہ مہینے پر روز ایک گھنٹہ کے لئے مقرر وقت پر حاضر ہوا کروں گا۔ البتہ اتوار اور چھٹی کے دن نہیں۔
بخاری صاحب بڑی ہموار طبعیت کے آدمی تھے۔ اکثر باتیں ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ غالباً وہ چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کو دوسروں کا مزاق اڑانے والے کا خمیازہ سمجھ کر ایسا کرتے تھے لیکن جب گرم ہوتے تو بہت گرم ہوجاتے مگر شاذونادر۔
بیدل صاحب اس زمانہ میں انارکلی کے دہلی مسلم ہوٹل میں رہتے تھے۔ ان کے پاس کبھی کبھی امتیاز، بخاری، اور چند اور دوست ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن بیدل صاحب نے ازراہ شفقت دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا شروع ہوا تو بیدل صاحب کو خیال آیا کہ بخاری صاحب کو دہی سے بہت رغبت ہے۔ بولے آپ لوگ دہی کھائیں گے۔ یک زبان ہو کر سب نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ بیدل صاحب نے آواز دی۔ ارے لمڈے۔ ایک آنے کا دہی لے آ۔ سستا زمانہ تھا لیکن ایک آنے کا دہی تو اس وقت بھی ایک ہی آنے کا ہوتا تھا۔ بیدل صاحب یہ دہی کیا ملنے کے لیے منگایا ہے، بیدل صاحب ذرا تنک مزاج تھے، برہم ہوگئے۔ بخاری صاحب نے بھی خلاف معمول برہمی کا جواب برہمی سے دیا۔ بہرحال بات آئی گئی ہوگئی لیکن لوگ بدمزہ ہو کر لوٹے۔
بخاری صاحب غیرارادی طور پر ہمیشہ محفل کی توجہ کا مرکز خود ہی رہنا چاہتے تھے۔کبھی علم میں ٹھٹھول کی چاشنی اور کبھی ٹھٹول میں علم کی لاگ لفظوں کے الٹ پھیر سے، بات کی برجستگی سے ذہانت اور حسب موقع معصوم روئی سے وہ ہر بات اور ہر حرکت میں ایک ایسی لذت بھر دیتے تھے کہ محفل کی نگاہیں اور کان ان کے لیے وقف ہوجاتے تھے۔
ایکٹر اور تمثیل کار ایک معنوں میں خوش نصیب ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کے مطابق اپنے پارٹ تجویز کرتے ہیں۔ کبھی تخت شاہی اور کبھی کاسہ گدائی، کبھی ہمہ وقت خوش باشی اور خوش کامی اور کبھی پیہم مصائب وآلام۔ لیکن زندگی کا رنگ نرالا ہے۔ اس میں اپنی پسند اور انتخاب کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ اس میں رنج اور خوشی توام ہیں۔ تاہم ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی زندگی کو تمثیل کارہی بنالے۔ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا صرف وہی رخ پیش

کرے جو اوروں کی خوشی اور اپنی بالیدگی کا باعث ہو۔ بخاری صاحب کی زندگی کا فلسفہ اور شیوہ یہی تھا۔ تاہم ان کے نیازمندوں میں دو تین ایسے شخص بھی تھےجن کے سامنے دکھ سے رو دیئےہوں یا خوشی سے ہنس پڑے ہوں۔ شاذونادر ہی سہی لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ چمکنے والا بخاری اور ہر بات میں امرت گھولنے والا بخاری اپنے کسی نیازمند کے پاس آدھ آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھا رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس کا دل اس کی زبان سے زیادہ بلاغت اور ندرت سے اپنی کہتا تھا۔ اور دوسروں کی سنتا تھا۔ یہ لمحے اس کے نیازمندوں کو نہیں بھول سکتے اور خواہ کوئی خود کو کتنا ہی زبان آور اور قلم کا دھنی کہے، بیان نہیں کئے جاسکتے:

محبت کےفسانے دیدہ ودل کی امانت ہیں
خیانت سے زباں کو محرم اسرار کرلینا

بخاری صاحب احسان فراموش نہیں تھے لیکن احسان مندی کے اعلان کے بھی قائل نہ تھے۔ ان کی رائے میں اظہار احسان مندی محسن کو خفیف اور خود کو بھکاری بنا دینے کے مترادف تھا۔ محکمہ تعلیم اور پھر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں وہ ہمیشہ جو مکھی لڑاتے رہے لیکن یہ کبھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ عمریا زید سے برسرپیکار ہیں۔ ایک بار ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں دشمن نے نرغہ کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکوٹیوکونسل کے ایک مسلمان ممبر نے بےطلب ودرخواست پانسہ بخاری صاحب کے حق میں پلٹ دیا اور یوں بخاری صاحب نے تشویش سے نجات پائی لیکن اس کے بعد بخاری صاحب ان صاحب کے سامنے پڑنے سے بچتے رہے۔ میں اس قصے سے آگاہ تھا۔ ایک دن میں نے بخاری صاحب سے کہا کہ دیکھو فلاں نے تمہاری یہ مدد کی اور تم یوں طرح دے جاتے ہو کہ سامنے جاکر سلام ودعا بھی نہیں کرتے۔ وہ تمہارے شکریہ کے محتاج نہیں لیکن تمہاری شرافت کا تو یہی تقاضا ہونا چاہیئےکہ تم شکرگزار ہو۔ بولے۔ سنو بھائی یہ پرانے زمانےکے بزرگ ہیں۔ بے کہے انہوں نے کرم فرمایا تھا۔ ان کے احساس خوش کاری اور فتح مندی کو میں شکریہ کے چند جملے کہہ کر کیوں ضائع کروں۔
دوران ملازمت میں ہر ملازم کی طرح بخاری صاحب کو بھی اکثر اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنی پڑتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کے چیرمین کی جگہ خالی ہوئی۔ بخاری صاحب کو نظرانداز کرکے ایک فرنگی کو چیرمین بنادیا گیا۔ بخاری صاحب نے پرنسپل سے تحریری احتجاج کیا۔ اس نے اپنے فیصلے کو بحال رکھتے ہوئے بخاری صاحب کی درخواست ڈائریکٹر تعلیمات کے پاس بھیج دی۔ ڈائریکٹر نے بھی پرنسپل کےفیصلے کو بدلنے سے انکار کردیا۔ بخاری صاحب نچلے نہ بیٹھے

اور درخواست صوبے کے گورنر کو محکمانہ وسیلے سے ارسال کردی۔ گورنر نے روبہ کاری کو بلایا اور کہا کہ گورنمنٹ کالج میں تو انگریزی کا چیرمین انگریز ہی کو ہونا چاہیئے۔ بخاری صاحب نے جواب دیا۔ حضور کا ارشاد بجا لیکن اگر گورنمنٹ کالج میں شعبہ انگریزی کا چیرمین انگریز ہی کو ہونا چاہیے تو اس انگریز کے پاس انگریزی کی فرسٹ کلاس ڈگری بھی ہونا چاہیئے۔ بخاری صاحب کی ڈگری فرسٹ کلاس تھی اور دوسرے شخص کے پاس سیکنڈ کلاس ڈگری تھی۔ فرنگی گورنر نے تالی بجا کر کہا کہ ملاقات نعرہ تحسین کے بعد ختم کی جاتی ہے اور بخاری صاحب شعبہ انگریزی کے چیرمین ہوگئے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں جب وہ ڈپٹی ڈائریکٹرجنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے ایک دو سال اچھے خاصے بدمزہ سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی اپنی پریشانی کا حال بیان نہیں کیا۔ اپنے تمام حربے استعمال کرتے رہے اور آخرکار تمام دشواریوں پر فتح پائی۔ ان کے ایک مچاٹے کا قصہ سینئے:

میں لاہور سے دلی گیا ہوا تھا۔ صرف ایک آدھ روز کے لیے۔ بغیر اطلاع بخاری صاحب سے ملنے ان کے دفتر پہنچا۔ گاڑی سے اُترا ہی تھا کے محکمے کے فرنگی افسر اعلیٰ سے آمنا سامنا ہوگیا۔ ان کی اور میری بےتکلف ملاقات تھی۔ وہ سمجھے کہ میں ان سے ملنے کو آیا ہوں۔ نہایت گرمجوشی سے ملے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد جب انہوں نے اپنے کمرے میں چلنے کو کہا تو میں نے بتایا کہ میرا مقصود اس وقت بخاری صاحب ہیں۔ یہ بات اسے چبھی لیکن خلش کو دور کرنے کے لیے اس نے سلسلہ گفتگو دراز کردیا۔ اچھے خاصے پندرہ منٹ کھڑے کھڑے اور باتیں کرتے گزرگئے تو بولا چلو میں تمہیں بخاری کے کمرے میں پہنچا دوں۔ بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ میرے اچانک پہنچنے پر متعجب اور خوش ہوئے۔ فوراً غالب کا مصرع پڑھا:

آئے خدا کرے یہاں پر نہ کرے خدا کہ یوں

مجھے بخاری صاحب کے کمرے میں پہنچا کر فرنگی رخصت ہوگیا۔ ہم دونوں باتوں میں مشغول ہوگئے لیکن چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ صاحب پھر آگئے۔ کاروباری بات کی مجھ سے معافی مانگتے ہوئے بخاری صاحب سے مخاطب ہوئے کہ ایک ضروری دورے پر وہ اگلے ہفتہ خود مدراس جائیں گے اور اس لیے بخاری صاحب کے پیش نظر جو بھی پروگرام ہو وہ منسوخ کردیا جائے۔ چونکہ بخاری صاحب کو دفتر میں موجود رہنا ہوگا۔ نہایت خوش ہو کر بخاری صاحب بولے۔ آپ ضرور مدراس جائیے شکر کا مقام ہے کہ میں گرمی کے زمانے میں ریل میں بیٹھ کر ریگستان کی خاک پھانکنے سے بچ گیا۔ دلی کا خوشگوار موسم، دفتر کا دل پسند کمرہ، میں نہایت خوشی سے دفتر میں

رہوں گا۔
وہ فرنگی افسر اعلٰی بخاری صاحب کو میرے آگے ہلکا بنانے آیا تھا لیکن خود سبک ہو کر واپس ہوگیا مگر خراشیدہ راست قصد خراش۔ دس منٹ کے بعد پھر آیا اور بولا بخاری صاحب مجھے کاغذات دیکھتے ہوئے خیال آیاکہ اگلے ہفتہ ایک دو معاملات کے لیے میری دلی میں موجودگی ضروری ہوگی۔ اس لیے اب تم ہی دورے پر مدراس چلے جاؤ۔ بخاری صاحب اچھل پڑے۔ تالیاں بجانے لگے۔ "اللہ وہ تاڑ کے لمبے لمبے جھومتے ہوئے درخت، وہ نیلا سمندر، وہ خاموش فضائیں، وہ فلاں اور فلاں سے ملاقات، یقین جانو صعوبت سفر دو لمحے بھی یاد نہ رہے گی"۔ اس شخص نے بھونچکا ہو کر بخاری صاحب کا منہ دیکھا اور کچھ کہے بغیر کلغی گرائے کمرے سے چلا گیا۔ میں اس ڈرامے کا تماشائی تھا۔ بخاری صاحب بولے۔ بھائی اگر یہ سال بھر اور رہ گیا تو یہاں سے پاگل خانے جائے گا۔
قصہ مختصر سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں لیکن آل انڈیا ریڈیو کا فرنگی چند ماہ کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہندوستان سے رخصت ہوگیا اور بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیو کے افسر اعلٰی مقرر ہوئے۔
بخاری صاحب آل انڈیا ریڈیوکے کنٹرولر جنرل ہوگئے لیکن بوجوہ یہ زمانہ بخاری صاحب کے دوستوں اور بخاری صاحب کے لیے خود ایک آزمائش کا دور تھا۔ آل انڈیا ریڈیو ایک نیا اور اس لیے پھیلنے اور بڑھنے والا محکمہ تھا۔ روز نئی نئی نوکریاں نکلتی تھیں اور ہرنوجوان اس محکمہ میں نوکری کا خواہشمند تھا۔
بخاری صاحب کے دوستوں نے پندار تعلقات میں سفارشی خطوط لکھنے شروع کئے اور اپنے اپنے امیدوار کی ناکامی پر ابتدا میں خفیف سی خفگی اور بعد ازاں رنجش کا اظہار شروع کردیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے کبھی کسی کی سفارش بخاری صاحب سے نہ کی۔ لیکن ایک روز گفتگو کرتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ مرد خدا فلاں دوست نے جو ہمارا محترم اور محسن ہے اپنے بیٹے کے لیے تمہیں لکھا اور تم آئیں بائیں شائیں کرگئے۔ یہ کیا طور ہے صاف لکھ دیتے کہ اس کو ملازمت دینا ممکن نہیں لیکن لیت ولعل میں ڈال دینا قطعی غلط ہے۔ بخاری صاحب نے جواب کی تمہید میں سرکاری قسم کی توجیہات پیش کیں جن سے ہر سرکاری ملازم واقف ہوتا ہے۔ پھر کہا کہ بھائی ہر ایک خواہش مند کونوکری کہاں سے دوں البتہ میں اس کمی اور کوتاہی کو اور ذرائع سے پورا کردیتا ہوں۔ مثلاً کوئی فلاں صاحب کا خط لائے تو میں کہہ دوں گا۔ دفتر میں خط لائیے۔ اور فلاں صاحب کا خط ہو کھول کر پڑھتا ہوا برآمدے میں آکر عرض گزاروں سے ملاقات کروں گا۔ غرض یہ کہ اسی طرح کسی سے دفتر کے کمرے میں اور کسی سے ڈرائنگ روم میں ملتا ہوں۔ بہت محترم اور عزیز

دوستوں کے سفارشیوں کو گھر پر ٹھہرا بھی لیتا ہوں۔موٹر میں صفدرجنگ اور ہمایوں کے مقبرے کی سیر بھی کرادیتا ہوں۔ نہایت لذیذ گفتگو کے بعد بولے کہ بھائی سفارشی خطوط کی پذیرائی اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہوں۔

بخاری صاحب نے شعرونثر میں بہت ہی کم لکھا ہے۔ شعر میں ایک نظم جس کا عنوان میں بھول رہا ہوں اور شاید کبھی چھپی بھی نہیں۔ دو تین غزلیں اور چند متفرق شعر ۔ نثر میں پطرس کے مضامین کے علاوہ ایک کہانی عشق کی خودکشی اور چند متفرق مضامین جو کہکشاں میں چھپے اور گالزوردی کا ایک ترجمہ سیب کا درخت۔ مجھے یاد نہیں کہ انگریزی میں ایک دو مضمون کے علاوہ جو پاکستان ٹائمز میں چھپے اور کوئی چیز بخاری صاحب نے لکھی ہو ۔ اس سرمایۂ ادب کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت اس کا انوکھاپن ہے۔۔۔ وہ پچیس تیس بلکہ چالیس پچاس شعر کہتے۔ دو ایک دوستوں کو ایک ایک کرکے کبھی ایک کبھی دوسرا شعر سناتے۔ تنقید سے مستفیض ہوتے جو شعر معیار پر پورا اترتا اسے رکھتے اور باقی اس طرح بھول جاتے جیسے کبھی لکھے ہی نہ تھے۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ بخاری صاحب پر بحیثیت ادیب یا نقاد کچھ عرض کروں۔ مجھ سے بہتر بہت سے حضرات ہیں جو مبسوط مضامین تحریر فرمائیں گے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ بخاری صاحب کو قدرت نے یہ دولت فراوانی سے عطا فرمائی تھی کہ وہ چھپے ہوئے کونوں میں اپنی ذہانت کی روشنی ڈال دیں اور ان گوشوں کو منور کردیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہوجائیں۔

بخاری صاحب محفل سازی اور محفل آرائی میں فرد تھے۔ اعلان آزادی کے بعد گورنمنٹ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے تو پھر طالب علمی کے زمانے سے ملتی جلتی محفلیں گرم کرنے کی سوجھی۔ میں اس زمانے میں ٹریننگ کالج میں تھا اور اس لئے ہرنوع ان کے بہت قریب۔ سال ڈیڑھ سال ایسا گذرا کہ 'من دانم ودل داندود اندل من' ہم دونوں کو بہت سی آسانیاں میسر تھیں، اس لیے بلالحاظ وقت یا قید لباس جب جی میں آیا ایک دوسرے کے پاس پہنچ گئے۔ شام کے بعد اور رات گئے تک کی صحبتوں میں، میں شریک نہ ہوسکتا تھا۔ میں ہمیشہ سے اس معاملے میں کچا ہوں اس لیے اس وقت بخاری صاحب موٹر میں بیٹھ کر ادھر اُدھردوستوں پر یورش کیا کرتے تھے بلکہ ملاقاتوں کو یقینی بنانے کے لیے انہوں نے ہر دس پندرہ دن کے بعداپنے گھر رات کے کھانے کی دعوتوں کا سلسلہ شروع کیا جو کئی مہینے چلتا رہا۔ دعوتوں میں ان کے پانچ چھ نیازمند شریک ہوتے تھے ان موقعوں پر وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میرے دوستوں کا خون سفید ہے۔ کھانے کو بلاؤ تو بلاتامل آبیٹھتے ہیں، ویسے ادھر کا کبھی رخ بھی نہیں کرتے۔ دس بارہ برس گذرگئے لیکن:

کسے کہ محرم باد صبا است میداند

که باوجود خزاں بوئے یاسمین باقی است

یہ قصے کہاں تک لکھے جاؤں اگر اس زمانے میں انتہائی عدیم الفرصتی نہ ہوتی تو بھی یہ داستان اتنی طویل ہے کہ اس کا لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ ایک بار میں نے بخاری صاحب سے کہا کہ میرے نزدیک 'کلچرڈ' آدمی کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ تنہائی سے نہ گھبرائے اور آپ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی سے خوف زدہ رہتے ہیں یعنی میرے نزدیک آپ کلچرڈ آدمی نہیں ہیں یا میری 'کلچرڈ' ہونے کی تعریف غلط ہے۔ باوجود میرے کچھ کہنے کے کوئی جواب نہ دیا۔ چہرے پر افسردگی نمایاں ہوگئی۔ میرا گمان ہے کہ بخاری صاحب کے تحت الشعور میں ان کی زندگی کے کم از کم آخری دس پندرہ سالوں میں جان لیوا مرض کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ضبط نے کبھی انہیں اجازت نہ دی کہ وہ اس کو ظاہر کریں۔ لیکن وہ ہمیشہ انجام مرض سے خائف رہے۔ اس دن کے بعد میں نے اس قسم کی کوئی بات بخاری صاحب سے نہ کی۔

* * *

ہنستے ہنستے

عصمت چغتائی

ہنستے ہنستے بے حال ہو کر نیر تخت سے نیچے لڑھک گئی۔
بس کرو اللہ کا واسطہ" میں نے کرتہ کے دامن سے آنسو پونچھ کر خوشامد سے" کہا۔ ہمارے پیٹوں میں مروڑیاں اٹھ رہی تھیں۔ سانس پھول گئی تھی۔ ہنسی چیخوں میں بدل گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا اگر ہنسی کا یہ زناٹا رہا تو کچھ دیر میں جسم بیچ میں سے دو ٹکڑے ہوجائےگا۔
یہ وہ زمانہ تھا جب بات بات پر ہنستی آتی تھی۔ کوئی پھسل پڑا ہنسی چھوٹ نکلی۔ مرغے نے کتے کی پلے کے ٹھونگ ماردی۔ وہ پیں پیں کرکے بھاگا اور قہقہوں کا طوفان ٹوٹ پڑا اور جو کہیں کس کی مے پوچھ لیا کہ بھئی کیوں ہنس رہی ہیں تو پس پھر تو ہنسی کا وہ شدید دورہ پڑجاتا کہ معمولی مار پیٹ سے بجائے قابو میں آنے کے اور بھی تیز ہوجاتا۔ ہنسی آسیب بن کر سوار ہوجاتی ہنس ہنس کر شل ہوجاتی، مڈیاں چٹخنے لگتیں، جبڑے دکھ جاتے۔ کسی صورت افاقہ نہ ہوتے دیکھ کر امام اپنی چپٹی سلیم شاہ لے کر تل پڑتیں اور ساری ہنسی ناک کے راستے نکال دینے کی دھمکی دیتیں۔ تب ہم ناکیں پونچھتے پیٹ پکڑے نیم تلے پڑے ہوئے اپنے مخصوص جھلنگے میں جا گرتے اور نئے سرے سے ہنسنے لگتے۔
عظیم بھائی کی کتابوں میں سے مضامین پطرس چرا کر پڑھنے کے بعد بھی ہم اسی قسم کی جان لیوا ہنسی کے بھنور میں پھنس گئے۔ ہماری کھی کھی کھوں کھوں سے ہماری برباد اور غم گین آپا کی سمع خیراشی ہونے لگی۔ دو دھپ سر پر جمائے کتاب چھین لے گئیں۔ مگر یہ ہم نہ جانے کون سی بار کتاب پڑھ رہے تھے۔ ہمیں جملے کے جملے یاد ہوگئے تھے جو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دہرائےجاتے تھے اور قلابازیاں لگائی جاتی تھیں ۔ نہ جانے ایک عمر میں کیوں بے بات ہنسی آتی ہے، اب وہی مضامین پڑھتی ہوں تو اتنی ہنسی نہیں آتی۔
اس وقت عظیم بھائی نے مزاح نگاری شروع نہیں کی تھی یا شاید ہم نے ان کے مضامین نہیں پڑھتے تھے۔ ملازموزی کے مضامین پر اتنی ہنسی نہیں آتی تھی جیسی کبھی آیا کرتی تھی۔ کچھ پھیکے سے لگنے لگے تھے نہ جانے کیوں۔ بس

پطرس بھاگئے اور ایک جان چھوڑ مزار جان سے ان پر عاشق ہوگئے۔ نہ جانے کیوں تخیل میں وہ اپنے ہم عمر سے نظر آتے تھے اور یقین تھا کہ اگر ان سے ملاقات ہوجائے ہم ضرورت انہیں پیڑ پر بندھی اس بان کی کھٹولی پر چڑھالے جائیں جو کنویں کے پاس نیم کی اونچی شاخوں پر شمیم اور چنو نے باندھ رکھی تھی۔

پطرس کی باتیں..... جی ہاں انہوں میں باتیں ہی کہوں گی۔ کیونکہ ان کی تحریریں بے ساختہ بولتی تھی۔ ان میں بڑی یگا نگت اور قربت محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے گھر کے زندہ ماحول میں بڑی بے تکلفی سے کھپتی تھی چھوٹے بڑے سب ہی انہیں پسند کرنے لگے۔

عظیم بھائی نے "قصر صحرا" لکھی تو ہم نے جی جان سے پڑھی مگر "قرآن و پردہ"..... "حدیث و پردہ" بڑی بور معلوم ہوئیں۔ خشک مردہ کتابیں ان کے کچھ مضامین اقتصادیات "ریاست" میں نکلتے تھے وہ ہمیں قطعی کھردرے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے جب ہمیں پطرس کے مضامین اس رغبت سے پڑھتے دیکھا تو کچھ مکدر سے ہوگئے۔

نانی عشو پڑھ کر ہنسنے کا دور گزر چکا تھا۔ سخت رومنٹک افسانوں سے کبھی شدید دل چسپی نہ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں پطرس بے طرح پسند آگئے۔ "میں ایک میاں ہوں" ہمارے گھر میں بالکل کیری کی چٹنی کی طرح چٹخارے لے کر پڑھا گیا۔ اماں تک نے پڑھ ڈالا اور جب اپنی پلنگڑی پر بیٹھ کروہ ہنسیں تو پان دان کی کلھیاں پھدک پھدک کر آپس میں ٹکرانے لگیں۔ میں تنقید نگار نہیں نہ میں کوئی بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ "میں ایک میاں ہوں" کے بعد سے پطرس کا رنگ دوسرے مزاح نگاروں میں جھلکنے لگا۔ عظیم بھائی نے تو اپنی ایک کہانی میں اعتراف بھی کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا۔ میں مزاح نگاری کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں، کیونکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ مگر میرے مطالعے کی تاریخ میں پہلا نام پطرس کا آتا ہے۔ میں پطرس کو اپنی جانب سے کوئی مقام نہیں دینا چاہ رہی ہوں۔ مجھے تو بس یہ کہنا کہ ایک عمر میں پطرس کی تحریریں دل کو ایسی لگی تھیں کہ ہم نے ایک دن جوش میں آکر پطرس کو خط لکھ مارا۔ ابا میاں کے بکس سے لفافہ اور ٹکٹ چرایا اور معرفت..... "تہذیب نسواں" ..... خط بھیج کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔

یااللہ تیری ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسی پر تو میں خدا کے وجود کی قائل ہوں۔ وہ خط قبلہ ممتاز علی صاحب نے کھول لیا اور مع لفافہ کے آپا کو جنہیں انہوں نے منہ بولی بیٹی بنایا تھا بھیج دیا۔ بلی مظلوم سی ایک چوہیا پکڑ لیتی ہے اور کم بخت اس سے مذاق کرتی ہے۔ کبھی دانت ماردیا،

کبھی گدگدادیا، کبھی پنجہ لڑھکا دیا۔ اس خط کے آنے کے بعد کئی روز ھماری گت اسی طرح بنتی رھی۔ ھمارا خط اونچی آواز میں ابا کے سامنے پڑھا گیا۔ ھر فل اسٹاپ پر سر پر چپتیں پڑتی جاتیں۔ خط میں ھم نے انھیں مسخر لونڈا سمجھ کر نھایت بے تکلفی فرمانے کی کوشش کی تھی۔ اب تک اس خط کا ایک ایک حرف دماغ پر داغا ھوا ھے۔ برسوں خیال ھی سے پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے۔ خط ھمیں تنبیہ دینے کے لئے بار بار پڑھایا جاتا تھا۔ ھم نے نھایت بے تکلفی سے اپنی دانت میں بالکل پطرس کے رنگ میں لکھا تھا۔ سب سے بھیانک جملہ تھا۔ "ابے پطرس! کیا گھاس کھاگیا ھے؟"

عوام" اس جملے سے ھماری دھجیاں بکھیرتے تھے۔ ھر شخص کو اجازت تھی" کہ بے تکلف ھمارے سر پر چپت جڑ دے۔ ظاھرھے کہ اس صلائے عام پر ھرنکتہ داں نے لبیک کھا۔ ھم حضرت ممتاز علی صاحب اور پطرس کی جان کو کوستے تھے۔ ھم مجرم جو تھے۔ صرف اس لئے نھیں کہ پطرس سے یا رانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی، بلکہ اس لئے کہ ھم نے اس لفافہ پر ٹکٹ لگایا، اس پر "سروس" لکھا تھا، جو صرف سرکاری ڈاک کے استعمال کے لئے ھوتا تھا۔ آٹھ آٹھ آنے جرمانہ الگ ٹھکا۔ سچ پوچھئے تو اس سانحہ کے بعد پطرس ھماری چڑ بن گئے۔ ھماری جملہ شیطانیوں کی فھرست بناتے وقت ھمیشہ اس واقعہ کو تکلیف دہ حد تک اھمیت دی جاتی۔

بعض اوقات ایک چھوٹی سی بات کا دل پر کتنے دن نقش رھتا ھے۔برسوں گزر گئے۔ لوگ بھول بھال گئے، مگر شاید دماغ نے ایک ننھی سی گانٹھ باندھ لی۔ بمبئی میں آئے سال بھر گزرا ھوگا کہ ایک دن ریڈیو اسٹیشن کسی صاحب نے فون کیا کہ بخاری صاحب آج کل بمبئی آئے ھوئے ھیں اور مجھ سے ملنا چاھتے ھیں۔ پھلا خیال یہ آیا کہ کوئی بھانہ کردو ں۔ کہہ و ں کہ بیمار ھوں، پھر سوچا یہ کیا حماقت ھے۔ پطرس آئے ھیں۔ یعنی سچ مچ پطرس آئے ھیں اور میں ان سے ملنے جان چرارھی ھوں۔ یعنی ان کو کیا پتہ کہ ایک دن ان کی بدولت میرے چپتیں پڑچکیں ھیں۔ وہ مجھے قطعی قابل ملاقات سمجھتے ھیں، جب ھی تو بلایا ھے۔ خیر لنچ کا وعدہ رھا۔

مگر میں نے شاھد سے کوئی ذکر نھیں کیا۔ انھوں نے بلایا تو شاھد کو بھی تھا لیکن میں نے بھانہ کردیا کہ انھیں قطعی فرصت نھیں۔ وھی میری نیم کے نیچے پڑے ھوئے جھلنگے والی ذھنیت! یہ ڈر کم بخت کاھے کا تھا۔ٹھیریئے آگے چل کر بتاؤں گی۔

مجھے ضرورت سے زیادہ ذھین اور جملہ باز لوگوں سے بہت ڈر لگتا ھے۔ ان کی شخصیت مجھے اپنا جانب کھینچتی بھی ھے اور دور بھی دھکیلتی ھے۔ اور پھر پطرس کا مجھ پر ویسے ھی رعب بیٹھا ھوا تھا۔ خواہ مخواہ ان سے مل کر اور احساس کمتری دونا ھوجائے۔ بڑی کوفت ھوئی نھیں جاتی ھوں تو نہ جانے

پھر کتنا پچھتانا پڑے۔ جاتی ہوں تو اللہ! نہ جانے کیسی چوٹیں کریں گے۔ ضرورت وبدتمیزی پر اترآؤں گی۔ قطعی جو جھیل جاؤں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شاہد کے سامنے میرا پول کھل جائے۔، وہ فوراً منٹو سے کہہ دیں گے کہ پطرس نے محترمہ کو وہ پٹخنیاں دیں کہ گھگھی بندھ گئی۔
رات بھر میں نے ان تمام جملوں کے جواب سوچے جو وہ کہیں گے اور میں منہ توڑ جواب دوں گی۔ بدقسمتی سے میری ساری محنت رائیگاں گئی۔ پطرس نے وہ سوال ہی نہ کئے۔ اُف میری حماقت! میں نے اپنے پروفیسروں سے کبھی مار نہ مانی۔ میرے استاد میری منہ زوری سے چوکنے رہتے تھے۔ میری کئی استانیاں کلاس میں آنسو بھر لاتیں۔ یہ میرا خاندانی ورثہ ہے اور مجھے اس پر بڑا ناز تھا۔ مگر اس دن احساس کمتری بے طرح بھوت بن کر گلا دبوچنے لگا ۔میں نے پطرس کی زندگی میں کبھی کسی سے ان احساسات کا ذکر نہ کیا۔ کوئی دل پر چھری رکھ دیتا۔ تب بھی نہ کرتی۔ کسی نے بچپن میں مجھے ہوّا بن کے ڈرانے کی کوشش کی، تو نے اس ہوّے کی پنڈلی کی بوٹی اتارلی تھی اور بجائے ڈرنے کے ڈرانے والے کی چیخیں نکل گئی تھی۔ مگر پطرس کے ہوّے نے مجھے ہولا ہولا کر شل کردیا۔ میں نے اپنے لباس کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا، مگر اس دن میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ایسی ساڑھی نکالی جس کا ذہن پر کوئی دھندلا سا نقش بھی نہ رہ جائے تا کہ کوئی حوالہ نہ دیا جاسکے۔ ہر شے مبہم ہوجائے۔ پطرس کے سامنے دال تو گلےگی نہیں صرف غائب ہوجانے والا ٹوپی پہننے ہی میں عافیت ہے۔
جب ریڈیو اسٹیشن جانے لگی تو دل سے دعا نکلی کاش پطرس بیمار پڑگئے ہوں یا میرے ہی پیٹ میں درد اٹھ ائے۔ ہسپتال فون کروادوں کہ آخری وقت ہے۔ لعنت ہے عصمت کی بچی تجھ پر پھر تو وہ ضرور ہسپتھال عیادت کو آئیں گے۔ بیگم اب تو مرنے میں بھی رہائی نہیں، کاندھا دینے تو وہ آہی پہنچیں گے۔ پھر میری چغتائی خون للکارا۔ میرے سکڑدادا نے کھوپڑیوں کا مینار چنوا کر اس پر بیٹھ کر خاصہ تناول فرمایا تھا، اور میں ایک حقیر پطرس کی دہشت میں فنا ہوئی جارہی ہو۔ ایسا بھی کیا ہے۔ ٹانگ کھینچیں تو اپنی ازلی بدزبانی پر اتر آنا مزاج ٹھکانے آجائیں گے شاہ صاحب کے! لیجئیے بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہنچی، تو کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔
"!آداب عرض"
گڈمارننگ"۔ جواب ملا۔"
اف بور" میں نے سوچا۔ اب فراٹے کی انگلش کا رعب ڈالیں گے۔ وہ جھکے" تھے۔ میں نے غور سے معائنہ شروع کردیا۔ "صورت تو کچھ زیادہ توپ نہیں" میں نے سوچا۔ سیدھی سادھی سانولی سلونی شکل ہے مگر تصویر سے نہیں

!ملتی۔ قطعی مختلف
کتنے دن قیام رہے گا؟" میں نے انہیں کاغذوں میں لوٹ پوٹ دیکھ کر پوچھا۔"
سوچا میں پہلے بولنا شروع کردوں تو پہلا وار میرا رہے گا۔ مگر دل ڈوبنے لگا
کہ پہلا وار نہایت پھسپھسارہا۔ ضرور اس جملہ می دھجیاں اڑیں گے۔
جی؟" وہ کاغذوں میں سے ابھرے، "میرا تبادلہ بمبئی کا ہوگیا ہے"۔"
یہ لیجئے، سنا تھا کسی میٹنگ کے سلسلہ میں بمبئی آئے ہیں بہت جلد جانے
والے ہیں، یہ آخر مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ کوئی اس میں بھی چال ہوگی۔
"اس سے قبل کوئی ار سوال جھاڑتی فرمانے لگے، "چلئے
خاصہ بورہے" میں نے بٹوہ اٹھا کر پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔ یہ دانت کیوں"
بار بار نکوستا ہے؟ سارا ریڈیو اسٹیشن گھما کر ایک کمرے میں مجھ سے
جانے کو کہا۔ سامنے میز پر ایک اونچے کاغذوں کے ڈھیر کے سامنے ایک
عقاب کی سی صورت کا گوراچٹا پٹھان بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے جیسی لمبی
ناک، بھاری بھاری آنکھیں
"آیئے آیئے ..... معاف کیجئے گا میری میٹنگ ذرا لمبی کھنچ گئی۔"
اوہ" میں نے سانولے سلونے پطرس کے جانے کے بعد کہا "میں سمجھ تھی آپ"
وہ ہیں"۔
کیا؟..... میں وہ ہوں ..... آپ میری متک کررہی ہیں۔ وہ برا مان گئے۔" وہ"
لکشمنن ہیں اور میں قطعی وہ نہیں ہوں۔ "ایک جھٹکے سے سارا اعصابی دباؤ
بھک سے اڑ گیا۔ ایرکنڈیشن کمرے میں ایک دم مجھے نیند سی آنے لگی۔ یاخدا
ناحق میں نے اس شخص کی اپنی جان پر اتنا مصیبت سوار کرلی۔ ایسا معلوم ہوا
میں انہیں برسوں سے جانتی ہوں۔ یہ عقاب تو قطعی فاختہ نکلی۔ پھر جو باتوں
کا ریلا چلا ہے تو میرا سارا ریہرسل بے کار ہوگا۔ سارے تراشے ہوئے جملے اڑ
چھو ہوگئے۔ تاج محل ہوٹل پہنچتے پہنچتے دو چار مسائل پر اختلاف بھی ہوگیا
میری خیال میں پطرس کی خاصیت یہی تھی کہ ان سے ملتے ہی برسوں کی
ملاقات کا احساس ہونے لگتاتھا۔ یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور مسرت
بھی کہ انہوں نے اس زمانے کے لکھنے والوں کا ایک ایک لفظ بڑی دل چسپی
سے پڑھا تھا، اور یاد رکھا تھا۔ انہیں جملے جملے ازبر تھے۔ شعر تو میں نے
بہت لوگوں کو یاد رکھتے سنا ہے مگر نثر صرف پطرس کی زبان سے اسی
طرح سنی۔
میرے کمرے میں چلنے پر کوئی اعتراض؟" بڑے بے تکلفی سے پوچھا۔"
"کیوں؟"
"ٹھیک، آیئے۔"
یہ اطلاع مجھے بعد میں ملی، کہ پطرس نہایت لوفر انسان ہیں۔ اس وقت مجھے
اندازہ نہیں تھا کہ میری ڈھیٹ کمانیوں کی وجہ سے لوگ مجھے بھی بڑی نٹ

کھٹ سمجھتے ہیں۔
میں نہایت بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز لیمونیڈ پیتی رہی۔ وہ پلنگ پر پھیلے ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر کی چسکیاں لیتے رہے اور دوقینچیاں اپنی پوری رفتار سے چلتی رہیں۔ باتوں کے طوفان میں بار بار یہ محسوس کر کے سخت کوفت ہوتی رہی کہ پطرس کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ برسوں کھر لی گھونگی پر تل کر عبث نہ ہو سکے گی اس لئے کیوں نہ قنوطیت پر اتر آؤں اور اپنی خاندانی کج بحثی کام میں لاؤں کہ بڑے بڑے سورماؤں پر آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ جمالت اور کم مائیگی کے لئے بہترین ڈھال۔
مگر بہت جلد معلوم ہوگیا کہ غنیم نہایت چوکس ہے۔ مجھ سے کئی سال پرانا اکھاڑے کا کج بحث ہے۔ تیرکی نوک بڑی چابک دستی سے واپس لوٹادیتا ہے۔ اس میدا میں بھی کھلی مار سے بہتر ہے اسے بزرگ مان کر ہتھیار ڈال دوں۔ شاگرد بن کر مسکین صورت سے سوالات کروں اور یہ لکچر جھاڑ کر حلق خشک کرے۔ موقع پاؤں تو ڈنک ماردوں۔ مگر توبہ کیجئے پطرس گھسے میں آنے والے آسامی نہ تھے۔ میرے ہر ذہین اور دقیق سوال میں نہایت بھونڈے پن سے "ہٹایئے بھی یہ بور نگ باتیں" کہہ کر میرا خوب جی جلایا۔
میں نے چڑ کی ان کی ہر بات کو الٹ کر بحث شروع کردی۔ انہوں نے میرے ہر پسندیدہ شاعر کو اور ادیب کو جاہل اور الو کہدیا۔ میں نے بھی کلس کی نہایت تہذیب اور سلیقہ سے انہیں احمق کہدیا۔ جس پر وہ بے تحاشہ ہنسے۔ میں نے پھر چڑ کر ان کا ساتھ دیا، گوجی یہ چاہ رہا تھا سرمانے رکھا ہوا لیمپ اسٹینڈ ان کے سر پر گرپڑے اور میں ہنستی رہوں۔
ارے ڈیڑھ بج گیا" گھڑی دیکھ کر وہ جلدی جلدی اپنا گلاس ختم کرنے لگے۔" پھر بھاری بھاری آنکھوں سے میر طرف ایسے دیکھا جیسے میں بالکل کوڑھ مغز ہوں اور پھر بےاختیار ہنسنے لگے۔ بالکل میرے بدذات بھائی چنو کی طرح۔ ایک دفعہ اس کے چڑانے پر میں نے گال پر ایسا پنجہ مارا تھا کہ چربی نکل آئی تھی۔
جلدی چلنا چاہیے ورنہ کھانے نہیں ملے گا۔" مطلع صاف ہوگیا اورہم نہایت" اطمینان سے ڈائننگ ہال میں جا کر مینو پڑھنے لگے۔ "اف یہ فرنچ کھانوں کے نام مجھے بڑے گندے لگتے ہیں۔" میں نے پھر جلانے کی کوشش کی۔ "سب کھانے ساڈین کی طرح بدبوار اور لس سے معلوم ہوتے ہیں۔"اس کے بعد مچھلیوں، گھونگوں اور سیپیوں پر بحث ہونی لگی۔ اب انھوں نے ایک دوسرا طریقہ نکالا۔ ہر بات پھر اتفاق کرنے لگے جس پر کوفت دوگنی ہوگئی۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ پطرس اتر جائیں تو دکھن جانے میں عافیت ہے۔ میں نے چاہا ان کی تحریروں کے بارے میں بات کروں مگر اس عرصے میں ہماری تعلکاقات اتنے کشیدہ ہوگئے تھے کہ وہ بھڑک گئے اور یہ بجا بھی تھا۔ اس وقت

میں ان کمانیوں کی تعریف کر کے ان کے چہرے پر آنے والی جھپکوں پر مسکرا کر جی ٹھنڈا کرنا چاہ رہی تھی، مگر وہ فوراً ادب کی محفل سے چھلانگ مار پر کھانے پر آگئے۔ کافی بدمزہ کھانا تھا۔ اسٹو کچا تھا جیسے چمڑے چبارہے ہوں۔ اشارے سے بیرے کو بلاکر بڑی لجاجت سے بولے:۔
دوست یہ بکرا تو سینگ ماررہا ہے کوئی مرا ہوا جانور نہیں پکار تمہارے" ہاں۔" بیرا بے چارہ کھسیانا ہوکر ہنس دیا۔ اور جب وہ پلیٹیں اٹھا کر چالاگیا تو ایک دم سے بولے:۔
تم سے لکشمنن کو پطرس کیوں سمجھا؟" اگر گدھے کو پطرس سمجھ لیا" ہوتاتو مجھے قطعی شکایت نہ ہوتی۔ "مجھے مسکراتا دیکھ کر بولنے سے پہلے چلدی سے بولے" شاید گدھے کو شکایت ہوتی۔" میں نے اتنی زور سے ٹھٹھ مارا کہ ہال میں مہذب لوگو بدبد کرتے کرتے ایک دم چونک کر دیکھنے لگے۔ پطرس نے تادیبی نظروں سے مجھ دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں:۔
درمیانہ درجہ کی چاردیواری میں پلی ہوئی لڑکی تاج محل ہوٹل کے آداب سے" کیسے واقف ہوسکتی ہے۔ اور ان کا خیال ٹھیک تھا۔ اس سے پہلے میں نے صرف ایک دفعہ تاج میں چائے پی تھی۔ اس وقت تک یہ پہلا اتنا شاندار ہوٹل جسے صرف دیکھنے کے لئے گئی تھی۔ تکلفات، سجاوٹ اور صفائی کو ہمارے گھر میں نہایت تحیقر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے گھر میں کھانے کی میز تو تھی اور جب نہایت غیر دلچسپ قسم کے مہمان آتے تھے تب اس پر سلائی کی مشین، اچار کی برنیاں اور بچہ کا گڈولنا اتار کی تخت کے نیچے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ چھپا دیا جاتا تھا۔ خاص مہمانوں کی چادر بچھا کر چنی کی پلیٹیں سجادی جاتی تھی۔ آپابڑے چاؤ میں آکر نپکن کے پھول بنا کر کلاسوں میں سنوار دیتیں۔ ہم لوگ اسے احمقانہ بناوٹ اور بے کار کی زحمت سمجھ کر نہایت تحقیر سے ہنستے اور انہیں چڑانے کو گلاس میں سے نپکن نکالے بغیر پانی بھر لیتے، آپا مہمانوں کے سامنے ہمارے جنگلی پن کی وجہ سے شرمندہ ہوتیں تو بڑا لطف آتا۔ ہم لوگ تو تانبے یا تام چینی کی رکابیوں میں کھانا لے کر بان کی چارپائی پر سینی رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ذرا پلنگ کی آدوائیں ڈھیلی ہوتی تو بڑا مزاآتا۔ کوئی موٹا آدمی بیٹھ جاتا تو سارا شوربہ گود میں رس آتا۔ بان کی ڈھیلی چارپائی پر بیٹھ کر پچھلے شوربہ کا سالن کھانا بھی ایک فن ہے۔ جس میں ہماری گھرانا ماہر تھا۔
تاج محل ہوٹل میں کانٹے چھری سے کھانا کھاتے وقت میری کندھے انجانے بوجھ سے تھک گئے۔ اور چغنائیت کو سخت ٹھیس لگی اور مجھے فوراً احساس برتری ہونے لگا۔ کم از کم اس میدان میں تو مجھے فوقیت حاصل تھی۔ پطرس کو روز روز اسی طمطراق سے کھانا پڑتا ہوگا۔ انہوں نے شاید کبھی کھاٹ پر بیٹھ کر آلو گوشست نہیں کھایا ہوگا۔ خاص کر جب کہ اس میں

پڑوسی کے باغ سے چرا کر نیبو نچوڑا گیا ہو۔ اس کے بعد بیرے نے پلیٹوں میں نہ جانے کیا لا کر رکھ دیا۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔ بڑے دھواں دھار طریقے پر کرشن چندر، بیدی، اور منٹو پر بحث ہونے لگی ۔ان کا خیال تھا تکلف میں ان کی تعریفیں کرتی ہوں تا کہ لوگ مجھے بڑا دریا دل سمجھیں اورمیں کہتی تھی میں خدا کی بھی جھوٹی تعریف نہیں کروں گی۔ ان کی کہانیاں میں نے تنقید نگار یا ایک کہانی نگار کی حیثیث سے انہیں ایک انسان کی حدیثت سے دل بہلانے کو پڑھی ہیں۔ کچھ بری بھی لگی ہیں اور کچھ نشتر بن کر دل میں ترازو ہوگئی ہیں۔

یہ جذباتیت ہے" انہوں نے رکھائی سے کہا۔"

جذباتیت کیا ہوتی ہے؟" میں نے بھونڈے پن سے کہا۔ وہ سمجھے بن رہی ہوں،" حالانکہ یہ سولہ سال پہلے کی بات ہے اور واقعی میری سمجھ میں بہت سے باتیں نہیں آئی تھیں۔ میں نے بہت سی باتوں کے نامعقول جواب دیئے۔ ان کی علمی بزرگی کے قائل ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصرتحریروں کی مداح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف میں کہا۔ جو کہا وہ نہایت بے رخی سے سنی ان سنی کرگئے۔ ان کی اپنی تخلیقات ان کے لئے اتنی اہم نہیں تھی۔ کم سے کم مجھے تو یہی اندازہ ہوا کہ وہ خود پرست نہیں۔

دو گھنٹے لنچ سے کھیلتے گزر گئے۔

آپ ڈرامہ کیوں لکھتی ہیں؟" انہیں اچانک بم گرانے میں بڑا مزا آتا تھا۔"

یونہی۔" میں نے لنگڑا ساجواب دیا۔"

میری رائے میں تو آپ ڈرامے لکھنا چھوڑ دیجئے۔ بڑے اوٹ پٹانگ ہوتے" ہیں۔ کوئی ایکٹ چھوٹا کوئی لمبا۔ سلیقہ سے کتربیونت کرنے کی بجائے آپ انہیں دانتوں سے کھسوٹتی ہیں۔" ان کی بوجھل عقابی آنکھیں میں ایذارسانی کی لذات کا نشہ ابھرآیا۔

جی چاہا میز کا سارا کوڑا کرکٹ ان کے اوپر لوٹ دوں اور یہ پلٹس کے مزے کی پڈنگ ان کے شاندار سوٹ پر لسٹر جائے۔ مگر نے جلدی سے بھڑکتے ہوئے رہوار کی لگامیں کھینچ لیں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی اتار کی نہایت نرمی سے کہا، "اچھا ....اب نہیں لکھوں گی۔" انہیں ناامیدی سی ہوئی کہ میں نے بحث کیوں کاٹ دی۔

مکالموں میں آپ کے کافی جان ہوتی ہے۔" اونھ، میں نے سوچا، یہ میرے" مکالمے تھوڑے ہوتے ہیں گھر میں سب ایسے ہی بولتے ہیں، میں دوسری زبان سے کہاں سے لاؤں۔

"برنارڈشا سے متاثر ہیں؟"

بے حد، میں نے ایک ڈرامہ میں برناڈشا کے یہاں سے پورا کا پورا سین اڑالیا"

ہے، کیوں کہ مجھے وہ سین بہت پسند آیا تھا۔ اس کا حوالہ بھی نہیں دیا مجھے اپنی آنے والی ذمہ داریوں کا اس وقت تک اندازہ نہیں تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن "جواب داری" کرنا ہوگی۔ اصل میں میں نے وہ سین ایک فلمی کہانی کے "لئے اڑایا تھا۔

میں نے سوچا اس سے پہلے یہ میری ٹانگ کھینچیں خود ہی کیوں نہ سر پھوڑلوں۔ "آپ بھی کے جردم جردم اور پی۔ جیوڈپاس سے متاثر ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہہ تو دیا، لیکن اب سوچتی ہوں کہ صرف ایک بات مشترک تھی، یعنی دونوں مزاح نگار تھے،۔ شاید چڑ کر کہہ دیا ہوگا۔ وہ نہای ہوشیاری سے ٹال گئے اور اشارے سے بیرے کو بلایا۔ بڑی پریشان صورت بناکر چاروں طرف دیکھا۔

معاف کیجئے گا۔" بڑے ادب سے مجھ سے معذرت چاہی، پھر سرگوشی میں" بیرے سے کچھ کہا۔ وہ بڑے زور زور سے سرہلانے لگا۔

صاحب آپ اطمینان رکھو، کوئی بات نہیں۔" بیرے نے ہمت بڑھائی۔"

نہیں اگر کوئی اعتراض ہوتو....." پھر سہم کر چاروں طرف دیکھا۔"

"آپ بولو صاب"

"منیجر صاحب کو تو کچھ"

"..... نہیں صاحب مینجر صاحب کو کون بولے گا؟" ..... ہم کو بولو"

پطرس نے بڑی شکرگزاری سے اسے دیکھا۔ پھر بالکل کان کے پاس ہونٹ لے جا کر بولے۔

"کافی۔"

کافی؟" بیرا چکرایا۔"

ہاں اور نمکین بسکٹ بھی۔" بیرامجسم سوال بناکبھی مجھے اور کبھی انہیں" دیکھنے لگا۔

کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے ..... شاباش"۔"

نہیں صاحب اطمینان رکھو" ..... بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا۔ جاتے" جاتے اس نے حیرت زدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا جیسے کہتا ہو، دماغ تو سلامت ہے حضور کا۔ پطرس نے نہایت معین خیز انداز میں آنکھ ماری، بے چارہ گھگیا کر ہنسنے لگا۔

اور مجھے معلوم ہوا پطرس مزاح نگار ہی نہیں ان کی زندگی میں شرارت اور چلبلا پن ہے۔ ان کی زبان میں لطیفے ہیں اور برتاؤ میں ہلکا پھلا پن ان کے طنز میں تیکھا پن ہے۔ انہوں نے زندگی کا تنگ و تاریک رخ نہیں دیکھا۔ وہ الجھنوں کا شکار نہیں تھے، آزاد اور زندگی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی تلخی اور جھنجھلاہٹ سے مکدر سے ہوجاتے تھے۔

جسم فروشی اور حرامی بچوں کے سوال کو وہ کچھ زیادہ مہذب نہیں سمجھتے

تھے۔ ان دنوں میں کسی سے بھی ملتی تھی، "لحاف" کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ میری چڑ سی ہوگئی۔ پطرس نے لحاف می نہیں اور بھی جنسی الجھنوں پر کوئی بحث نہ کی۔
میں اپنی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہتی ہوں۔" میں نے انہیں ذرا" رسانیت کے موڈ میں پاکر کہا۔
کیوں؟" وہ بڑے کھرے پن سے بولے، "آپ کی کہانیاں ترجمہ نہ ہوں گی تو کیا" انگریزی ادب غریب رہ جائے گا یا شاید آپ کے خیال ہے، انگریزی کا جامہ پہن "کے تحریر زیادہ بلند ہوجائےگی۔
پھر جی جلا۔ ایک دم سے یہ انشان اتنا خشک کیوں ہوجاتا ہے۔ "نےہیں، یہ باتر تو نہیں اصل میں انگریزی میں چھپنےح سے پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ احمد علی "نے ایک کہانیت کے مجھے چعارع نبونڈ دلوائے تھے۔
کچھ لاجواب سے ہوگئے اور مسکرانے لگے، "فکر نہ کیجئے ایک دن آئے گا لوگ خود می اس طرف توجہ دیں گے۔" پھر میں نے فکر نہ کی۔
ایک ایک لمحہ مر لطف گزرا۔ گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ابھی زنبیل میں بہت کچھ تھا۔ وہ مجھے چرچ گیٹ اسٹیشن تک چھوڑ گئے۔ میں ان دنوں ملاڈ رہتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے بارے میں ایک مضمون لکھا جو میں نے نہیں پڑھا، لوگوں سے ٹکڑے سنے۔ ایک بار دہلی جانا ہوا تو دعوت میں بلایا۔ وہاں فیض بھی تھے۔ مگر بڑی چپ چاپ سی محفل تھی۔ جس کا میرے دماغ پر دھندلا سا بھی عکس نہیں۔ کچھ سیاست کی باتیں زیادہ ہوئیں جو میرے پلے نہیں پڑیں۔
سال بھی بعد میں نے نوکری سے استعفادے دیا۔ شاہد کی نوکری بھی کچھ ڈھل مل سے نظر آنے لگی۔ میں نے پھر نوکری کا ارادہ کیا۔ نہ جانے کیا دل میں سمائی پطرس کو لکھ مارا کہ نوکری چاہیے کہیں بھی ملے۔ چار پانچ سو سے کم میں گزر نہیں گی۔ ہفتہ بھر کے اندر چھسو روپے کی نوکری معہ تقرر کی خط کے مل گئی۔ اس عرصہ میں مجھے فلم کا کام مل گیا تھا اور شاہد کو بھی ڈائرکشن مل گیا۔ میں نے پطرس کو بڑي شرمندگی کا خط لکھا۔ معافی مانگی۔ پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ جاگیریں بٹیں، زبان بٹی، ادب بٹا اور ادیبوں کا بھی بٹوارا ہوگی۔ آدھا کنبہ یہاں آدھا وہاں چلاگیا۔ پطرس ادب کی دنیا سے سیاست کے آسمان پر پہنچ گئے۔
مگر نقوش میں ان کا ایک خط پڑھ کر نجانے کیوں محسوس ہوا ..... پطرس دور جاکر بھی پاس ہی کھڑے ہیں۔ آج ہی میں نے "مضامین پطرس خریدے ہے، پڑھ رہی ہوں۔ پڑھ کر پلنگ سے نیچے گرنے کی نوبت تو نہیں آئی مگر میرے دل و دماغ کی تکان سی اتررہی ہے۔ وہ قلم جو تھکے ہوئے دماغوں کو ایک

لمحہ کے لئے بھی مہلت بخش دے خاموش ہوچکا، مگر دور میرے تخیل میں دو بھاری بھاری غلافی آنکھیں آج بھی بے ساختہ مسکرا رہی ہیں۔"

* * *

پطرس بخاری مرحوم

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

پطرس صاحب کی زندگی دل کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی بعض وابستگیوں کے ڈانڈے ایک بین الاقوامی افق سے ٹکراتے تھے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بقول ان کے ان کے دل میں تنہا ایک ملک یا قطعہ ارضی کی یاد نہیں بلکہ بیک وقت چھ ملکوں کی یادیں سمائی ہوئی تھیں۔ وہ ان سب کو سینے سے لگائے رکھتے اور کسی ایک وقت بھی دل سے الگ نہ ہونے دیتے۔ یہ ان کے وسیع القلب ہونے کی دلیل تھی۔

اس وسعت کی ساتھ ساتھ ان کی شخصیت میں ایک لوچ بھی تھا۔ وہ جہاں بھی ہوتے جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس ماحول میں سمولیتے یا یوں کہئے کہ اس ماحول کو اپنا لیتے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک یادان کی دل سے ہمیشہ لپٹی رہتی اور اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہ پڑتی وہ لاہور شہر کی یاد تھی اور اس کا شہر کا وہ بلند اور نمایاں ٹکڑا جسے دنیا گورنمنٹ کالج کے نام سے پکارتی ہے۔

بخاری مرحوم اس کالج کے طالب علم بھی رہے ہیں۔ ان کی اعلےٰ کا آغاز بھی یہیں سے ہوا تھا، ان کی علمی اور ادبی زندگی یہیں پروان دکھائیں لیکن اس کالج کے خیال سے کبھی غافل نہ رہے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ انہیں اس ادارے کو چھوڑ کربامر جانا پڑا۔ ان کے قدم دنیا بھر میں گھومے، ان کے فکروذہن نے بڑی بڑی پروازیں دکھائیں لیکن اس کالج کے خیال سے کبھی غافل نہ رہے۔

ریڈیو کے محکمہ میں تقریباً دس سال گزارنے کے بعد ۱۹۴۷ء کے اوائل میں

دوبارہ کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے وارد ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دن کے لئے بھی اس سے الگ نہیں ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جن ان کا سامان ٹرک سے اتارا جارہا تھا تو وہ میرے ساتھ کالج کے وسیع صحنوں اور سرسبز میدانوں میں گشت لگارہے تھے اور ان کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کا تبسم صاف صاف بتا رہا تھا کہ انہیں اس قدیمی ماحول میں اپنے آپ کو دیکھ کر کتنی مسرت ہورہی ہے۔ ان کے ذہن میں کالج کی عظیم الشان عمارت کا گوشہ گوشہ بدستور تازہ تھا۔ وہ ان میں سے یوں گزررہے تھے جیسے کوئی اپنے پرانے گھر میں پھر رہا ہو۔ وہ جہاں کوئی نئی چیز بھی دیکھتے تو انہیں اس میں اجنبی پن محسوس نہ ہوتا۔ جہاں کوئی چیز اپنی اصلی جگہ سے ہلی ہوتی تو کہتے ہیں! یہ کیا ہوا؟

بہرحال وہ اس کوچے کے ذرے ذرے سے آشنا تھے، کیونکہ ادھر مدتوں آئے گئے تھے۔

ان کے کالج میں آنے کے فوراً بعد حالات بگڑگئے۔ لاہور میں مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہوئے لیکن بخاری صاحب مرحوم نے کالج کی فضا کو بڑی خوش اسلوبی سے محفوظ رکھا۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد حالات ابھی مخدوش تھے۔ مقامی طلباء اور اساتذہ کی طبعیتیں اکھڑی اکھڑی تھیں، اور باہر سے وارد ہونے والے اصحاب پریشانی کے عالم میں تھے۔ اس ابتری کی حالت میں انہوں نے کالج کو سنبھالا اور اس احتیاط اور محبت سے سنبھالا کہ اس کی روایات اور شان میں فرق نہ آیا۔

مجھے خوب یاد ہے کالج میں فسٹ ایر کے داخلے کے دن قریب آرہے تھے۔ اخبارات میں داخلے کا اعلان ہوچکا تھا۔ داخلے کے فارم تقسیم ہورہے تھے۔ داخل ہونے والے بچوں کی ہر طرف چہل پہل تھی۔ بخاری صاحب کے قدم غیر معمولی طور پر تیزی سے ہر طرف اٹھ رہے تھے۔ کبھی وہ نووارد امیدواروں کو دیکھتے، کبھی دفتر کے کلرکوں پر نظر ڈالتے، کبھی دوسرے کالجوں میں پہنچ کر وہاں کی فضا کو بھانپتے۔ ان کی دماغ میں ایک خلجان تھا۔ وہ یہ کہ کیا گورنمنٹ کالج میں آنے والے طلباء اسی قدیم معیار کے ہوں گے؟ کیا اس کی شنان حسب معلوم بلند رہے گی؟ کیا اس کی روایات میں فرق تو نہیں آئے گا؟ جب درخواستیں گزارنے کا آخری دن آیا تو وہ صبح سے بے چین رہے۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد ہیڈ کلرک سے امیدواروں کی تعداد اور ان کی استعداد کے بارے میں پوچھتے۔ جب شام کو پانچ بجے انھیں معلوم ہوا کہ فسٹ ڈویژن میں پاس ہونے والے امیدواروں کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تک پہنچ چکی ہے تو وہ خوش سے اچھل پڑے اور بے ساختہ کہنے لگے ..... صوفی! ہمارے بچوں میں

بڑی جان ہے! اس کالج کو زندہ رکھیں گے۔
داخلے میں انہوں نے کیا کیا کچھ کیا؟ یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو ان کے شریک کار رہے۔ اللہ جانے انہوں نے کتنے بلکتے ہوئے بچوں کے آنسو پونچھے، کتنے نادار اور مایوس انسانوں کی ڈھارس بندھائی۔ اس عالیشان عمارت میں قدم رکھتے ہوئے جھجکتے لڑھکڑاتے قدموں کو سہارا دیا، اور اس کام کے لئے انہیں محکمہ تعلیم، افسران بالا، وزرا کے آستانوں غرض جہاں جہاں بھی جانا پڑا، گئے اور امداد لے کر آئے۔ ایسے مخدوش حالات میں انہوں نے کالج کے لئے وہ کچھ کیا کہ شاید کوئی دوسرا نہ کرسکتا۔
ایک دن چند بے تکلف احباب کی صحبت میں بیٹھے ہوئے کہنے لگے، دوستو! تمہیں معلوم ہے گورنمنٹ کالج کا فارغ التحصیل طالب علم جہاں کہیں بھی ہو سب سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات، اس کا لب و لہجہ فوراً بتا دیتا ہے کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے ماحول اور ہمارے معیار کی بدولت ہے۔ اب اردو ایم اے کی کلاس شروع ہونے والی ہے۔ میں سوچتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر ہم نے انگریزی ایم اے کلاس کی طرح اسے بھی نہ سنبھالا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ اور ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد اس کی حیثیت ادیب فاضل اور منشی فاضل کی سی نہ رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اردو کی ایم اے کلاس کی یونیورسٹی سے الگ تھلگ چلایا اور اس میں بڑی سرگرمی اور تندہی سے کام کی۔ اگر وہ امریکہ نہ چلے جاتے تو اس کے لئے کیا کچھ نہ کرتے۔
کالج کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی ان کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں اور اگر انہیں یہاں ٹھہرنے کا کام کرنے کا موقعہ ملتا تو یہ ادارے اللہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ لیکن حکومت ان سے اور خدمت لینا چاہتی تھی۔ انہیں بار بار باہر جانا پڑتا لیکن اس غیر حاضری میں بھی ان کا دل کالج کی یاد سے خالی نہ ہوتا۔ چند مہینوں کے بعد جب وہ لوٹ کر آتے تو گھر پہنچنے سے پہلے کالج کے سامنے موٹر کو کھڑا کر کے ادھر ادھر نظر ڈالتے اور ایک خوشی کی لہر ان کے چہرے پر دوڑ جاتی۔ یوں محسوس ہوتا کہ وہ اس جگہ کے ایک ایک ذرے سے لپٹ رہے ہیں۔
گورنمنٹ کالج میں ان کی حیثیت محض ایک معلم، استاد، یا پرنسپل کی نہیں تھی۔ وہ طالب علموں کو صرف پڑھاتے نہیں تھے۔ وہ زندگی میں ان کی مشفق رہنما اور دوست بھی تھے۔ طالب علموں کی ذہنی استعدادوں کو ٹٹولنا، انہیں ابھارنا، ان کی محنتوں کو صحیح راہ پہ چلانا، ان کی زندگی کو سنوارنا، ان کا ایک اہم فریضہ حیات تھا، اور ایک دل چسپ مشغلہ۔ اس کے لئے وہ نئے نئے تعلیمی ادبی، تفریحی حیلے سوچتے رہتے۔ مشاعرے، ڈرامے، مناظرے، ادبی مجلسیں قائم کرتے اور اس طرح طالب علموں کو مصروف کار رکھتے۔

کالج کے مشاعروں میں وہ نہ صرف صدارت کرتے بلکہ داد سخن بھی دیتے اور خود بھی شعر سناتے۔ ڈراموں میں ان کی عملی شرکت نے اس فن کو اس سرزمین میں ایک خاص معیار عطا کیاتھا۔ وہ خود نئے نئے ڈرامے ترجمہ کرتے، خود پارٹ بھی کرتے اور اداکاری کے ساتھ ساتھ ہدایت کار بھی ہوتے۔ انہوں نے کالج میں ادبی سوسائیٹیوں کے ہوتے ہوئے ایک الگ "اردو مجلس" قائم کی جس کے ہفتے وار جلسے انہیں کے مکان پر ہوتے تھے۔ جس میں شریک ہونے والے کچھ احباب اور کچھ مخصوص طالب علم ہوتے۔ ان مجلسوں میں علمی، ادبی مقالے پڑھے جاتے اور ایک نہایت بے تکلف فضا اور ماحول میں ان پر بے لوث تنقید بھی کی جاتی۔ تنقید کا مقصد تخریب نہیں بلکہ تہذیب ہوتی تھی۔ اس مجلس میں شریک ہونے والے اول اول طلباء وہ نوجوان تھے جو آج اپنی علمی ادبی حیثیت سے اپنے دیس کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں میری مراد آغا حمید، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیاء پوری، ن، م ، راشد جیسی شخصیتوں سے ہے۔ غرض بخاری صاحب مرحوم غیر معمولی طور پر گورنمنٹ کالج سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اس ادارے کی یاد کو زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا اور جہاں بھی رہے اسے فراموش نہ کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ خود کالج کی سرزمین بھی ان کی یاد سے خالی نہ تھی۔ آج جگہ جگہ ان کی محبت کے آثار نظر آتے ہیں اور ان کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے شاگردوں کے دل اس محبت کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کالج کی فضا میں جن استادوں کی یادیں اور آوازیں گونجتی رہی ہیں۔ ان میں بخاری کی آواز "نوائے زمرمہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔

ء کی بات ہے، شام کا وقت تھا۔ پروفیسر بخاری اور میں بیٹھے کالج ۱۹۴۸ کی باتیں کررہے تھے۔ میں نے کالج کی تدریسی اور ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کچھ تجویزیں پیش کیں۔ ہنس کر بولے، صوفی! یہ تو شعر ہوئے۔ تم "نے سنائے اور میں نے سن کر داد دی۔

میں چپ ہوگیا۔

کچھ وقفے کے بعد بولے، "سنو!" تم استاد ہو، اور میں کالج کا پرنسپل۔ ہمارا کام اس درس گاہ کے نظم و نسق کو عملی طور پر آگے بڑھانا ہے۔ میرے نزدیک وہ تجاوز جو عملی صورت میں نہیں آتی، خواہ وہ آسمان ہی سے کیوں نہ نازل ہوئی ہو، محض ذہنی عیاشی ہے اور میں ذہنی عیاشیوں میں شعروں اور "دوستانہ خوش گپیوں کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں۔

میں نے مرزا بیدل کی ایک غزل جو اسی روز پڑھی تھی سنائی شروع کردی۔

رات کچھ بے چینی سی رہی۔ ایک مدر سے کالج میں اردو کی تدریس شبانہ جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے "ادیب فاضل کلاس" کی تدریس کا ایک مکمل "پیش نامہ" مرتب کرلیا، اور اس کی تین نقلیں بھی تیار

کردیں۔ شام کو یہ مسل بغل میں دبائے بخاری صاحب کے مکان پر پہنچا۔
"یانہوں نے پوچھا، "ضلع کچہری سے آئے ہو؟
"میں نے کہا، "گھر سے آرہا ہوں۔
"تو یہ پلندہ کیسا ہے؟"
"میرے ذاتی کاغذات ہیں۔"
"ٹھیک، بیٹھو"
ان دنوں پرنسپل کے مکان میں سرکاری کاغذات کا داخلہ ممنوع تھا۔ ایک آدھ ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد میں جھجکتے جھجکتے اپنا تجویز کلام سنانا شروع کیا۔
میں نے کہا "عام شائقین کے لئے اردو کی اعلیٰتدریس کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ ارادہ ہے کالج میں ادیب فاضل کی ایک کلاس شام کو جاری کی جائے۔ اس کلاس کے جملے نظم و نسق، ترتیب و تدوین اور درس کا کفیل کالج "می ہو۔
"حسب معلوم کہنے لگے، "یہ طرحیہ اشعار ہیں؟
"میں نے کہہ، "جی ہاں۔ مطلع سنا چکا ہوں، پوری غزل یہ رہی۔
یہ کہہ کر میں نے کاغذات کا پلندہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اسے پڑھتےجاتے اور ان کا چہرہ خوشی اور مسرت سے تمتماجاتا تھا۔ درمیان میں کہیں کہیں وہ کچھ سوال بھی پوچھتے جاتے۔ میں جواب دیتا اور ہتا، "آپ سارا مسودہ پڑھ "لیں آپ کو معلوم ہوجائے گا۔
کاغذات ختم ہوئے تو بولے:۔
"ہوں، گویا میں بھی پڑھاؤں گا۔"
"میں نے کہا، "آپ فقط پرنسپل ہی نہیں، استاد بھی ہیں۔"
"کیوں نہیں۔"
اس کے بعد انہوں نے ایک سگرٹ سلگایا، جس کا دھواں تھوڑے ہی وقفے میں برآمدے کے ہر گوشے میں لہرارہا تھا۔
شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ موٹر کار میں بیٹھ کر شہر میں گھومنے لگے۔ جہاں جاتے اسی غزل کی تلاوت ہوتی اور پڑھنے کے ساتھ ہی اس طرح داد بھی دیتے کہ دوسروں کے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی۔ اہل فکر حضرات اور مشفق احباب سب نے اسے سراہا۔ اس تبلیغی اعلان اور نشری پر چار میں آدھی رات گزر گئی۔
صبح کو یہ بات لاہور کی گلی گلی کوچے میں گشت لگارہی تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر تمام ضروری مراحل طے ہوگئے۔ محکمانہ اجازت، اشتہارواعلان اور درخواستوں کی طلبی، امیدواروں کی پیشی، داخلہ اور پڑھائی۔
پروفیسر بخاری اپنے روز مرہ مشاغل میں خواہ وہ فرائض منصبی سے تعلق

رکھتے ہوں یا نجی ہوں ایسے ہی مستعدی سے کام لیتے تھے۔ زندگی میں ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔
قدرت نے انہیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی معاملہ فہمی اور جزرسی اس ذہانت کو اور بھی چمکاری تھی۔ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو بھانپ لیتے تھے۔ اس کے حسن و قبیح اور دور رس نتائج کو دیکھتے تھے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت عمل بڑی تیزی سے کام کرتے تھی اور وہ کسی خیال کے آتے ہی اسے فی الفور عملی جامہ پہنادینے کے عادت تھی لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ معمولی کی اقدام کے لئے بھی کئی دن تک غور کرتے رہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھے چلتے پھرتے سوچتے تھے دوسروں سے مشورہ بھی لیتے تھے اور اس مشورہ طلبی میں ایسے حسن تدبر سے کام لیتے تھے کہ بات بھی سلجھ جائے اور کسی کو اصلی راز کا پتہ بھی نہ چلے ۔ جب ذہنی جائزہ لینے کے بعد انہیں پورا اطمینان ہوجاتا تب وہ قدم اٹھاتے اور بجلی سی تیزی کے ساتھ اس کام کی تکمیل کے درپے ہوجاتے تھے۔
کاموں کی تکمیل کے لئے دوسروں سے مدد لینے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ اپنے عملی اقدام کا چرچا بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ دوسروں کی ہمدردی اور رفیقان کار کی اعانت ہمیشہ ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ پھر ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی اتنا خوش آید ہوتا تھاکہ دیکھنے والوں میں بھی تکمیل کار کا ایک غیر معمولی ولولہ پیدا ہوجاتا تھا اور وہ خود ان کے شریک کار بن جاتے تھے اور اس شرکت میں ایک راحت محسوس کرتے تھے۔
بخاری کا مقولہ تھا کہ کسی کام کے صحیح تکمیل کے لئے انسان میں محض شوق نہیں۔ بلکہ چسکا ہونا چاہئیے چنانچہ وہ جب بھی کسی کام کرکرتے تھے تو ایسے ذوق و شوق سے کرتے، کہ گویا انہیں اس کام کا چسکا ہے۔ ان کا یہ ذوق و شوق ایک سہولت اور آسانی پیدا کرتا، ان میں ایک قدرتی روانی اور حسن آجاتا اور ان کی تکمیل ایک فطری تقاضے کی تکمیل معلوم ہوتی تھی۔ بخاری جس کام کو کرتے۔ ایسی سرگرمی، ایسے انہماک اور شغف سے کرتے، کہ معلوم ہوتا یہی ان کا فطرعی مشغلہ ہے اور قدرت نے انہیں اسی کام کے لئے بنایا ہے۔ لیکن وہ تمام کاروبار زلیت کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے۔ ان کے نزدیک ہر کام کے لئے ایک پیشہ وارانہ مہارت درکار تھی۔ جب تک کوئی مشغلہ فن نہیں بن جاتا اپنی صحیح حیثیث کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ انسان کام کرے تو حس کار کو کام میں لائے، نہیں تو بے کار رہے۔
بخاری نے ایک بے چین طبیعت پائی تھی۔ ان کا دماغ ان کے جسم سے، اور ان کا جسم ان کے دماغ سے زیادہ تیز کام کرتا تھا ان کے ذہنی اطوار اور عملی رفتار ہمیشہ ہم آہنگ رہتے۔ اس لئے انتہائی مصروفیتوں میں بھی ان کی طبیعت

پر کوئی ناگوار بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ ہر تکمیل کار ان کے لئے خاص لذت اندوزی کا سامان مہیا کرتی تھی، وہ کسی شے کو معمولی حالت میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کی طبیعت کی اپج اس میں ہر روز کوئی نہ کوئی تغیر چاہتی تھی۔ اگر یہ تغیر ثاقت نہ ہوتو ہر مشغلہ اپنی دل چسپی کھودیتاہے اور اس کی یکسانیت اسے بے کیف بنادیتی ہے۔ بخاری کو یہ یکسانیت کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی وہ سمجھتے تھے کہ ایسی یکسانیت سے نہ صرف کام کی رفتار ڈھیلی پڑجاتی ہے بلکہ کام کرنے والے کی طبیعت کو بھی زنگ لگ جاتاہے۔ گورنمنٹ کالج میں مجلس کا قیام، محکمہ تعلیم میں منتخب کتابوں کے تراجم، ریڈیو کے نئے نئے نشری پرگرام سب کے سب اسی اپج کانتیجہ تھے۔
بخاری کی تیز رفتاری کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ مجلس کے ہفتہ وار ادبی اجلاس پطرس ہال انمی کا مکان پر ہوا کرتے تھے۔ ایک شام جب مجلس کی کاروائی شروع ہونےوالی تھی، وہ ساتھ کے کمرے سے نکل آئے۔ آستنیں چڑھی ہوئیں، ماتھ گردآلود تھے۔ بولے، آج میں سخت مصروف ہوں، آپ میرا انتظار نہ کرتیں میں شریک محفل نہ ہوسکوں گا۔ بات ختم ہوئی، دوسرے روز معلوم ہوا مک آپ نے رات بھر میں ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب کی پچیس سالہ
کارگزاریوں کی ایک رپورٹ مرتب کرلی۔ اس رپورٹ کی ترتیب میں انہیں سینکڑوں مسلوں کو کھنگالنا پڑا۔ متفرق اور ان سے ضرور مواد کا انتخاب اور اس کی تدوین و تہذیب کوئی آسان کام نہ تھا۔ دفتری کاروائی کی جاتی تو شاید مہینے لگ جاتے، لیکن یہ کٹھن کام ان کے تنما ماتھوں نے ایک رات میں سرانجام دیا۔
یہاں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ صبح سویرے بخاری صاحب یہ رپورٹ لے کر دفتر پہنچے۔ ان کا خیال تھا افسراں بالا ان کی اس خدمت گزاری کا اور تیز کاری پر خوش ہوں گے۔ لیکن وہاں اس وقت کرسی منصب پر ایک ایسے صاحب براجماں تھے جن کی قابلیت نبض کہنے خالی تھی۔ انہوں نے بڑی تمکنت اور رعونت سے رپورٹ کو ماتھوں میں لیا، ورق کو الٹ پلٹ کردیکھا اور پھرنہایت بے پرتواویاانداز میں بولے "یہ کیا لکھا ہے..... خیر کوئی بات نہیں میں درست کرلوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے رپورٹ کاغذات کی ٹوکری میں ڈال دی۔ بخاری نے یہ سب کچھ دیکھا اور سنا۔ کوئی صاحب ذوق یہ لفظ کہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ ایک نااہل کا اس افسرانہ لہجے میں گفتگو کرنا نہایت ناگوار گزرا۔ انہوں نے لپک کر رپورٹ اٹھائی اور پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دی۔
"میں ہیں یہ کیا حماقت کررہے ہو؟"
"اگر یہ رپورٹ اچھی نہیں تو اس کا رکھنا بے کار ہے۔"
بخاری یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ افسر

کے کمرے میں دفتر کے چپراسیوں کا ایک بڑا دستہ بیٹھا رپورٹ کے پھاڑے ہوئے کاغذات کے ٹکڑے جوڑ رہا ہے۔
صلۂ کار کی کسے تمنا نہیں ہوتی، لیکن جب کوئی کام کسی لالچ کے بغیر یا حصولِ نام و نمود سے بے نیاز ہو کر کیا جائے اور وہ بھی دوستوں کی خاطر کیا جائے اور پھر اس کام کو یوں ٹھکرایا جائے تو انسان کے دل کو ضرور ٹھیس لگتی ہے۔ نااہل ہاتھوں نے جو چرکے لگائے تھے معلوم نہیں کہاں تک ان پھٹے ہوئے کاغذوں پر چیپیوں نے مرہم کا کام کیا۔ یہ بخاری صاحب کا دل ہی بتا سکتا ہے میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کا چابکدستی دونوں طرح اپنا جوہر دکھا کے رہی۔
ایک مرتبہ ان کے رفیقوں میں سے ایک صاحب یونیوسٹی کے کسی رکن کی غلط کے کسی رکن کی غلط کاریوں پر چیں بہ جبیں ہو رہے تھے۔ بخاری صاحب کہنے لگے، "بھائی صاحب! میری دو باتیں یاد رکھو۔ زندگی میں الجھنا ہو تو کسی بڑے مسئلے پر الجھنا چاہیے اور اپنے سے بڑی آدمی کے ساتھ الجھنا چاہیے ورنہ مزہ نہیں آتا۔ انسان کی قوتیں اور کوششیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں۔ بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعداد کار اور بھی چمکتی ہے۔ مجھے دیکھو! میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی اور اللہ کے فضل و کرم سے "کامیاب رہا ہوں۔
بظاہر ٹکراؤ ایک ناگوار سی شے ہے اور کاموں کی تکمیل میں ایک رکاوٹ سا نظر آتا ہے لیکن جب اس کی بنیاد کسی بڑے اصول پر ہو اور ٹکرانے والے اہل لوگ ہوں تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بخاری کی طبعیت کا خاصہ تھا کہ وہ ہمیشہ ایسی رکاوٹوں سے خوش ہوتے تھے۔ رکاوٹوں سے خوش ہوتے تھے۔ روکاوٹوں سے ان کی طبعی صلاحتیں اور استعدادیں اور بھی ابھرتی تھی۔ ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ وہ ان رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہوتے وقت کبھی تھکن یا تلخی محسوس نہیں کرتے تھے اور تو اور خود ان سے ٹکرانے والا جب ان سے شکست کھاتا تھا تو اسے اپنی شکست کا اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا ان کی عظمت اور برتری کا۔
ریڈیو کے محکمے میں ان کا بالتدریج آگے بڑھنا اور آگے بڑھ کر محکمے پر چھا جانا ایک ایسا ہی کارنامہ ہے۔ انہوں نے دس سال کے عرصے میں ریڈیو کو جو وسعت اور شہرت دی وہ ان کی ذہانت اور مستعدی کی بین دلیل ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں ریڈیو پروگرام اور بالخصوص خبروں کی نشر و اشاعت کا کام بہت کٹھن تھا۔ اس بارے میں انگریز حکام اور ان کی پالیسی بارہا ان کے آڑے آئی لیکن انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک طرف ان کی تصرفات کی روک تھام کی اور دوسرے طرف اپنی پالیسی کے پیش نظر ریڈیو کے وقار

کو برقرار رکھا۔ خبروں کا اہتمام ریڈیو کے پروگرام کا سب سے اہم کام ہے۔ اس کی اہمیت کو غالباً ریڈیو کے عملے کے کارکنوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسے موزوں بننے بلکہ ایک فنی شکل و صورت دینے میں بخاری صاحب کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس میں ان کی شخصیت کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

انہیں نئی نئی تجویزیں سوجھتی تھیں۔ ایک مرتبہ حسب معمول انہوں نے حکومت کو لکھا کہ ریڈیو پروگرام میں بہت سی مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر انہیں شائع کر کے محفوظ کرلیا جائے تو ایک ادبی خدمت بھی ہوگی۔ چونکہ جنگ کا زمانہ تھا۔ انہوں نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ بعض پروگراموں میں جنگی پرچار کے عنصر پوشیدہ ہوتے ہی۔ چھپ جانے کی صورت میں وہ بھی کارآمد ثابت ہوں گے۔ اس تجویز کا جواب کوئی آٹھ مہینے کے بعد موصل ہوا۔ تجویز رد کرنے میں جہاں بہت سے دلائل تھے وہاں ایک دلیل یہ تھی کہ جنگ اب جلد ختم ہونے والی ہے لہٰذا ایسے مواد کو چھپنا بے موسع ہے۔ بخاری نے اس دلیل کو پڑھ کر لکھا "ہاں درست، لیکن اگر ہماری حکومت اسی رفتار سے کام کرتی رہی تو "امن" کا دور بھی جلد ختم ہوجائے گا۔"

پطرس کے مضامین بخاری صاحب کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مزاح نگاری بظاہر بڑی ہلکی پھلکی شے ہے لیکن طنز نگاری کی طرح ایک لطیف شے کو پیدا کرنے کے لئے ایک بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی۔ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرز بیان کی قوت نہ ہو وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہوسکتا۔ انسانی اعمال میں بعض حرکات بڑی مضحیکہ خیز ہوتی ہیں، لیکن ہر انسانی آنکھ انہیں نمایاں طور پر نہیں دیکھتی۔ ایک مشاہدہ کار انسان انہیں بروئے کار لاتا ہے اور ان کا اظہار لطیف اور شگفتہ انداز میں اس طرح کرتا ہے کہ وہ تحت شعور سے ابھر کی اجاگر ہوجاتی ہیں اور ہم ان انسانی لغزشوں کو دیکھ کر مسکرادیتے ہیں۔

بخاری کی نظر بڑی وسیع اور گہری تھی اور پھر اسے بیان پر قدرت حاصل تھی، اس لئے وہ بے ساختہ ان حرکارت کو دیکھتے سمجھتے اور چمکاتے رہتے تھے۔

مذکورہ بالا ریڈیو مسل کا التوا میں پڑ جانا روز مرہ کا معمول ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اسے دفتری سرخ فیتے کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھ کر ٹال دیتا، لیکن بخاری کی نظر التوا کے تمام پہلوؤں پر پڑتی تھی۔

مشاعروں کی بے طرحی سے کون واقف نہیں اور شہروں کی گندی حالت کو کون نہیں جانتا۔ لیکن "کتے" اور "لاہور کا جغرافیہ" بخاری ہی لکھ سکتے تھے۔ بخاری کا مزاحیہ انداز ان کی تحریروں تک ہی محدود نہیں ان کی تقریریں بھی مزاح سے مزین ہوتی تھیں۔ وہ بڑے سے بڑے اہم اور سنجیدہ

مسائل پر بحص کرتے ہوئے اسی حربے کو کام میں لاتے تھے ۔ احباب کی صحبتوں اور عام موقعوں پر بھی اسے بے ساختہ استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مجمع میں ان کی گفتگو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی اور لوگ پہروں ان کے پاس بیٹھنے سےنہیں اکتاتے تھے۔
لیکن اس سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ بخاری کی ذات میں جو کشش تھی وہ محض ان کی مزاح گوئی کی وجہ سے تھی۔ بے شک ان کا مزاح ملنے والوں کے دل میں ایک شگفتگی پیدا کرتا تھا لیکن انہیں قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان میں خلوص بھی تھا۔ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور عام لوگوں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتے تھے۔ اس رکھ رکھاؤ میں دوست داری بھی ہوتی تھی اور سلیقہ بھی۔ عام ملاقاتوں میں جہاں انسانی منافقت کام کرتی ہے وہ اس آراستگی سے بات کرتے تھے کہ طبیعت کو خوش گوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ چھیڑ چھاڑ کے خوگر تھے لیکن اس چھیڑ چھاڑ سے ان کی مراد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اس سے لگاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔
بخاری صاحب کو اپنے ان کرشموں کا پورا پورا احساس ہوتا تھا، بلکہ وہ دوسروں پر اکثر ایک خاص تفوق محسوس بھی کرتے تھے اور اس تفوق سے دوسروں کو اپنے مطابق چلاتے بھی رہتے تھے۔ جہاں کہیں ان کی طاقت لسانی کاگر نہیں ہوتی تھی وہ اپنی مزاحیہ گفتگو کو چھوڑ کر کوئی ایسی حرکت بھی کرسکتے تھے جو دوسروں کو چپ کراسکے یا انہیں شکست دے سکے۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں جب قومی زبان کا مسئلہ پیش ہوا تو بنگال کے ایک صاحب اقدار بزرگ نے بنگالی زبان کی حمایت میں بڑی پرزور تقریر کی۔ بخاری نے اپنی بذلہ سنجیوں سے انہیں بہت کچھ مرعوب کرنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی دوسرے روزہ وہ بزرگ اپنے عقائد کی تائید میں کچھ اعداد و شمار پیش کرنے والے تھے۔ بخاری صاحب کو ایسے مسودے کے مؤثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ ان کے پاس ہی بیٹھے۔ اچانک آپ کی نظر ایک کاغذ پر پڑی۔ تاڑ گئے، ہونہ ہو یہ اعداد وشمار کا پلندہ ہے۔ انہوں نے چپکے سے وہ پلندہ نکالیا جب وہ بزرگ پر جوش خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اعداد و شمار پرآئے اور کاغذوں پر ہاتھ ڈالا تو غائب تھے۔ پریشانی میں جیبوں کو ٹٹولتے رہے اور یہ معصوم صورت بنائے ان سےہمدردانہ استفسار کرتے چلے گئے۔ ان کی بدحواسی پر محفل میں ایک کہرام سا مچا۔ جب محفل کا رنگ بگڑ گیا تو بخاری نے اچانک جھک کر میز کے نیچے سے وہی پلندہ اٹھا کہ انہیں دکھایا اور بھولے انداز میں کہا:۔
"آپ یہ تو تلاش نہیں کر رہے؟"
اس پر ایک زور کا قہقہ لگا اور ساری بات ہنسی مذاق کی نظر ہوگئی۔
دوستداری، بخاری صاحب کا شیوہ ہی نہیں مسلک بھی تھا۔ اگرچہ اس دوست

داری میں گرم جوشی اور وفورِ جذبات کا اظہار بہت کم ہوتاتھا۔ وہ آہوں اور آنسوؤں سے زیادہ جذبات محبت کے اعتدال اور اخفا کے قائل تھے۔ اس بارے میں ان کا گرم جوش دل مغرب کی خنک فضاؤں میں سانس لیتا رہتا تھا اور اپنی آگ کو دبائے رکھتا تھا۔

بظاہر دیکھو تو بخاری صاحب پورے "صاحب لوگ" تھے۔ ان کی وضع قطع، ان کا لباس، ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، باتیں کرنے سے یورپینی انداز ٹپکتے تھے۔ وہ مشرقی طرز بود وباش پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ بازار میں گھومنے جائیے تو معلوم ہوتا تھا۔ انہیں یہاں ،کی کوئی حرکت پسند نہیں

"وہ دیکھو، تہ بند کے ساتھ انگریزی قمیص۔"

"سبحان اللہ چپلی کے ساتھ پتلون۔"

"ٹائی اور شلوار کیا کہنے۔"

"یہ شخص بازار میں کھڑا کباب کھارہاہے۔"

"یہ دیکھئے اس نے بائیسکل بازار میں بغیر اشارے کے گھمادی۔"

"اور یہ چار آدمی صف باندھے چلے آرہے ہیں۔ میں موٹر کہاں سے گزاروں۔"

یہ فقرے مسلسل آپ کے کان میں پڑیں گے اور آپ انہیں سنتے سنتے اپنے ملک بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہوجائیں گے ۔ آپ کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے گا۔ جو خامی آپ میں نہیں وہ بھی نظرآئے گی۔

لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بخاری صاحب مغربی طریق زندگی کے قالب سے نکلے ہوئے ایک مجسمہ تھے اور ان میں کوئی لوچ نہیں تھا۔ ان کی صورت شکل مغربی اور مزاج مشرقی تھا۔ ان کی ذات مغرب و مشرق کا تضاد نہیں بلکہ ایک لطیف امتزاج پیش کرتی تھی۔

ان کی مشرق مزاجی کو دیکھنا ہو ان می کے گھر کی چار دیواری میں دیکھئے جہاں ہر شے مغربی انداز میں جلوہ گر ہے۔ لیکن جہاں زندگی کی حرکات ٹھیٹھ مشرقی فضا میں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہی بے پروا، لاابالیانہ پن، وہی بے تکلف گفتگو، وہی خلوص آمیز میل ملاپ، یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے لنڈن یا نیویارک کے کسی مکان میں دلّی کے بلّی ماروں کے حملے والے اچانک آبسے ہوں اور وہ ماحول کے لئے اجنبی اور ماحول ان کے لئے اجنبی ہو۔ کوئی یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ دن بھر اتنی باقاعدگی اور مستعدی سے مشین کی طرح مسلسل کام کرنے والا رات کو کیونکر جاگتا ہوگا، لیکن بخاری صاحب کی شب بیداری کو ان کے ساتھ راتیں گزارنے والے ہی جانتے ہیں۔ رات کے دس گیارہ بجے کے بعد گھر سے گھومنے کے لئے نکلنا ان کا روز مرہ کا شیوہ بلکہ معمول۔ کوئی مقصد، کوئی منزل مقصود نہیں محض گھومنا اور گھومنا اور گھومتے گھومتے کسی سنسان سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں گپیں

مانکنا، یہ تھی ان کی تفریح، جس میں ان کے تمام ہم قدم دوست برابر کے شریک ہوتے تھے۔ مجال نہیں کہ کوئی شب خیز اس ثواب سے محروم رہ جائے۔ بیدل کے دقیق اشعار، شیکسپئر کے ڈرامے، ایلیٹ کے مجرد نگاری، منٹو کے افسانے انہیں خوش گپیوں کے تحت میں آجاتے تھے۔
راتوں کی یہ بیداری ان کے روزانہ کاموں میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ جس طرح دوستوں کو ایک ایک کر کے جمع کیا تھا اسی طرح ایک ایک کو گھر پر چھوڑنے کے بعد وہ بستر پر آکر لیٹتے تھے اور ایک آدھ گھنٹ آرام کے کرنے کے بعد حسب معمولی اٹھ کر روز مرّہ کے مشاغل میں کھو جاتے تھے اور اس معمول پر وہ سختی سے کار بند تھے۔ اور خود ہی نہیں بلکہ اپنے رفیقانِ کارسے خواہ وہ ان کے کتنے ہی بے تکلف دوست کیوں نہ ہوں، اسی باقاعدگی اور ضبط کی توقع رکھتے تھے۔ کسی طرح کی بے قاعدگی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
بارہا ایسا ہوا کہ رات بھر گھومنے کے بعد ہم پانچ بجے صبح کو لوٹے۔ پونے "آٹھ بجے انہوں نے میرے یہاں ٹیلی فون کر کے پوچھا، "صوفی کہاں ہے؟
"بچوں نے کہا، "وہ یونیورسٹی گئے ہیں، کوئی کام؟
"کوئی نہیں ، یونہی پوچھاتھا۔"
ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ رات کی سیر نہ مجھے اپنے فرائض منصبی سے غافل کردیا ہو۔ ان کے نزدیک دوستی اور فرائض بجاآوری دو الگ الگ خانے تھے۔
ریڈیو کے زمانے میں ان کے ایک دوسر سے کوئی کوتامی ہوئی۔ انہوں نے بڑی سختی سے مواخذہ کیا۔ دوست ان کی غیر معمولی خفگی پر بگڑ گئے اور استفعے لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ انہوں نے بڑے افسرانہ وقار کے ساتھ لے لیا اور کہا بہت اچھا آپ تشریف لے جائیے۔
دفتر کے بعد بخاری صاحب اس دوست کے مکان پر بیٹھے دیگر احباب کے ساتھ معافی مانگ رہے تھے۔
پروفیسربخاری کی ذات ایسی جامع صفات تھی کہ ان کی وفات پر یوں احساس ہوتا ہے کہ بیک وقت بہت سی شخصیتیں ہم سے الگ ہوگئیں۔ ان کے رخصت ہونے سے دنیا ایک معاملہ فہم، ہوش مند مفکر سے محروم ہوگئی۔ علم و دانش کے درس گاہوں سے ایک شفیق استاد چل بسا۔ اردو ادب ایک خوش فکر، خوش نگار انشا پرداز پطرس کا ماتم کررہا ہے۔
یہ سب کچھ ہے لیکن ان کی موت ان کے دوستوں کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ ایک ایسا صدمہ جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ وہ ایک مخلص مشفق دوست کو کھو بیٹھے ہیں۔ ایسے مہربان دوسری دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔
بخاری صاحب میرے محترم استاد بھی تھے، رفیق کار بھی اور پیارے دوست

بھی۔ میرا ان کا تعارف ۱۹۲۴ء میں ہوا، اور اس کم و بیش تیس سال کے عرصے میں ان کا احترام، ان کی ہمدردانہ رہنمائی اور خلوص دوستی ایک عجیب امتزاج کے ساتھ دل کو لبھاتی اور گرماتی ہی ۔ان کی خوش دوقی ان کی بذلہ گوئی، ان کے قہقہے جہاں دوستوں کے محفلوں کو جگمگاتے تھے وہاں ان کی پرسکون خاموش گرم جوشی اور محبت اور شفقت کی تڑپ احباب کے دکھی دلوں کی آہوں اور آنسوؤں کا ساتھ دیتی۔

آخری بار جب وہ امریکہ سے لاہور آئے اور چند روز یہاں ٹھہرے تو ایک بار پھر یہ محفلیں جاگ اٹھیں اور زندگی کی بہت سی یادیں پھر زندہ ہوگئیں۔ اس ایک بات کو تقریباً ایک سال گزر چکا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی وہ کل ہمارے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کتنا تازہ تھا ان کا پیار ا ر کتنی تیز تھی ان کی یاد۔ ان کی ایک نظر زندگی کے بہت سے گوشوں کو ٹٹولتی اور ایک بات کئی ایک سوئے ہوئے جذبات کو اکساتی تھی۔ انکے پاس بیٹھنے سے دل کی گم شدہ دنیا ئیں از سرنو آباد ہوجاتیں اور زندگی پیچھے کو کروٹیں لے لے کر مٹے ہوئے نقش ابھارتی چلی جاتی۔

ان کی کونسی بات ہے جو رہ رہ کر نہیں ستاتی، لیکن وہ جب کبھی کچھ عرصہ ملک سے باہر رہ کر لاہور میں آتے تو یہی کہتے، دوستو! غربت میں تمہاری یاد بہت ستاتی ہے اور اس یاد کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت، اس کا احترام طوفان جذبات بن کر رگوں میں دوڑنے لگتاہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے، انسان کا ہر قدم منزل دوست کی طرف اٹھ رہا ہے، جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی طرف والہانہ انداز میں لپک لپک کر جارہاو۔ تم لوگ یہاں بیٹھ کر اس بات کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ اس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔

مجھ سے بخاری کی جدائی کا حال نہ پوچھئے۔ ان کا مسلسل خلوص، یہ احسان اور اس احسان کا احساس ہمیشہ تیز اور تازہ رہنا اور خیال ہوتا کہ زندگی تو کیا اپنی موت بھی اسی کے آنسوؤں کا سہارا لے گی۔ لیکن یا خبر تھی کہ ان آنکھوں کو ان کے فراق میں آنسو بہانے پڑیں گے۔

کتنی جدائیوں کے کھائے ہیں زخم دل پر
کتنی محبتوں کے ماتم کئے ہیں ہم نے

(۱۳۷۸ھ)

* * *

اے ۔ایس ۔بی

شوکت تھانوی

زیڈ۔ اے۔ بی" کے بڑے بھائی کو ہم لوگ "اے۔ایس۔بی" ہی کہا کرتے تھے" ورنہ محض بخاری صاحب کہنے میں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کون سے بخاری صاحب، بڑے یا چھوٹے؟ اور پورا نام لینے میں یعنی احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کہنے میں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اتنی سی تو عمر ہے اتنے بڑے بڑے نام لے کر اس کی خواہ مخواہ فضول خرچی کیوں کی جائے۔ لہذا ریڈیو والے عموماً ان دونوں بھائیوں کو اےایس بی اور زیڈ اے بی ہی کہنے میں کفایت شعاری کے زریں اصول پر عمل کیا کرتے تھے ..... لیکن یہ میں نے بیچ دھڑے سے ریڈیو کی بات کہاں شروع کردی۔ ریڈیو سے تو میرا تعلق اس وقت پیدا ہوا ہے جو آل انڈیا ریڈیو کا لکھنو اسٹیشن قائم کیا گیا ہے اور میں اے۔ ایس۔بی سے بحیثیت پطرس کے اس سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ یعنی اس وقت جو میں لکھنؤ سے بحیثیت "ٹاکر" تقریباً ہر ہفتہ آل انڈیا ریڈیو دہلی جایا کرتا تھا اور تاکے بیٹھا تھا کہ پطرس سے ملاقات ہوتے ہی ان کو بھی اسی طرح پھانس لوں گا جس طرح مولانا نیاز فتحپوری، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کو پھانس چکا ہوں۔ اپنے ایک مجموعہ مضامین پر مولانا نیاز فتح پوری سے مقدمہ لکھوا چکا تھا۔ اس مجموعے کا نام "بحر تبسم" تھا۔ دوسرے مجموعہ "سیلاب تبسم" پر مرزا عظیم بیگ چغتائی سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ تیسرے مجموعہ "طوفان تبسم" پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے مقدمہ لکھا تھا۔ چوتھے مجموعہ "دنیائے تبسم" پر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ تھا اور اب ایک اور مجموعہ پر مقدمہ لکھنے کو پطرس بخاری پر نشانہ باندھ چکا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو اپنی تقریر نشر کرنے دہلی گیا تو اس نئے مجموعے سے مسلح ہوکر گیا اور بخاری صاحب کو ان کے دفتر میں جالیا۔ بڑے خلوص سے ملے بلکہ مجھ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ نہیں مل رہا ہوں، یعنی ان سے مرعوب ہونا چاہتا اور وہ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ مرچند کہ وہ جس وقت ڈپٹی کنٹرولر براڈ کاسٹنگ کی کرسی پر بیٹھے تھے، مگر مجھ کو اس سے کیا میں تو ایک عظیم مزاح نگار کے سامنے ان کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے حاضر تھا اور ان کی عظمت کا احساس مجھ پر طاری تھا۔ جس کو وہ اپنے انتہائی یگانگت اور مساوات کے برتاؤ سے غیر محسوس بنائے دیتے تھے۔ آخر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں حرف

مطلب زبان پر لایا اور بخاری صاحب سے اپنے نئے مجموعہ مضامین پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تو بڑی خندہ پیشانی سے بولے:۔
"یہ کیا مقدمہ بازی لے بیٹھے آپ؟"
میں نے عرض کیا، "جی ہاں یہ چھوٹا منہ بڑی بات ضرور ہے مگر میں آپ سے وعدہ لیے بغیر ٹلنے والا نہیں ہوں۔"
کچھ ہنستی ہوئی آنکھوں سے گھورا۔ کچھ سر پر ہاتھ پھیرا اور گویا عاجز آکر مسکراتے ہوئے بولے، "اگر آپ اپنے مقدمہ نگاروں کی ٹیم ہی مکمل کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے لکھ دوں گا مقدمہ۔"
وہ وعدہ لیکر میں بڑے فاتحانہ انداز سے واپس آیا۔ مگر اس ملاقات کے بعد ہی حالات کچھ کے کچھ ہوگئے۔ آل انڈیا ریڈیو نے لکھنو میں بھی اپنا اسٹیشن کھول دیا اور اس اسٹیشن کے ڈائریکٹر جگل کشور مہر اور پروگرام ڈائریکٹر ملک حسیب احمد نے اپنے محکمہ کو نجانے کیا پٹی پڑھائی کہ مجھ کو بھی صحافت چھوڑ کر ریڈیو سے وابستہ ہوجانا پڑا۔ اور اس کے چند ہی دن بعد میرا وہ مسودہ جو میں بخاری صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا مجھ کو ان کے اس خط کے ساتھ واپس مل گیا کہ "اب جو کہ آپ کو ریڈیو میں ایک منصب حاصل ہوچکا ہے عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ مجھ سے مقدمہ نہ لکھوائیں اور میں مقدمہ نہ لکھوں۔" بات بھی ٹھیک تھی لہذا یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہ گیا اور بقول بخاری صاحب کے میری مقدمہ نگاروں کی ٹیم مکمل نہ ہوسکی۔
اب بخاری صاحب محکمہ کے افسر اعلیٰ تھے اور میں محکمہ کا ایک ادنیٰ کارپرداز۔ لہذا جب وہ لکھنؤ اسٹیشن معائنہ کے لئے تشریف لائے تو میں نے ان سے دانستہ کترانے کی کوشش کی، مگر خود انہوں نے عمداً گھیر گھیر کر اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اس توجہ سے کام لیتے رہے۔ مگر مجھ کو اپنے حدود کا اندازہ تھا اور میں ان حدود سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ کچھ دن کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ بخاری صاحب کے جس سلوک کو میں اپنے ساتھ خصوصیت سمجھتا تھا وہ ہر ایک کے لئے عام تھا اور ان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ سرکاری اور محکمہ جاتی کام کے وقت وہ نہایت بھاری بھر کم قسم کے افسر بنے رہتے تھے اور کام ختم ہوتے ہی نجی صحبتوں میں ان ہی سب کے بے تکلف دوست بن جایا کرتے تھے جن پر تھوڑی دیر پہلے ان کا رعب قائم رہ چکا تھا۔انھیں لطیفے سنا رہے ہیں، نئےلطیفے سنانے کی فرمائش کررہے ہیں، بات سے بات پیدا کر رہے ہیں، ہنس رہے ہیں اور ہنسا رہے ہیں۔
ایک دن اسی قسم کی نجی صحبت میں ہنس بول رہے تھے کہ ایک بھولی بسری بات یاد کر کے ٹہلتے ہوئے میرے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں بولے:۔
"مجھ کو بری کرنے کے بعد آپ نے وہ مقدمہ کس پر دائر کیا؟"
"میں نے کہا، "کسی پر نہیں، وہ مجموعہ بغیر مقدمہ کہ چھپ گیا۔

"کہنے لگے، "اور میری یہ سزا بحال رہی کہ میں اسے نہ پڑھ سکوں۔
میں کتاب پیش نہ کرنے پر ابھی پوری طرح نادم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا، "آخر لوگ مقدمہ لکھواتے ہی کیوں ہیں۔ مجھے تو یہ حرکت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کسی کی انگلی پکڑ کر ٹہل "رہا ہو بلکہ انگلی پکڑ کر میلہ دیکھنے گیا ہو۔
میں نے اعتراف کیا کہ "جی ہاں میں اس حماقت کو سمجھ چکا ہوں اور اب اس "مقدمہ بازی کے چکر میں نہ پھنسوں گا۔
بڑی سنجیدگی سے بولے، "اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت دے۔
کچھ ہی دنوں بعد مجھ کو لاہور سے پنچولی آرٹ پکچرز والوں نےطلب کرلیا۔ اور میں نے ریڈیو سے علیحدگی کے وقت بخاری صاحب کو ایک الوداعی خط لکھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا کہ:۔
امتیاز (سید امتیاز علی تاج) کے بعد آپ کے بھی پنچولی آخر نکل ہی آئی،" خداوند کریم آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ آپ جارہے ہیں خدا حافظ۔ ریڈیو کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ دروازہ صرف جانے کے لئے "آنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔
اور جب پنچولی آرٹ پکچرز سے گزیٹیڈ افسر بننے کے شوق میں سونگ پبلسٹی آفیسر ہو کر میں پھر لکھنو آگیا تو بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر نہیں بلکہ کنٹرولر براڈ کاسٹنگ کی حیثیت سے لکھنؤ کے دورے پر آئے اور مجھے خاص طور پر ملنے کے لئے بلابھیجا۔ میں نے اپنی تازہ کتاب "شیش محل" پیش کی اور جب دوسرے دن ریڈیو والوں نے ان کے ساتھ ہی مجھ کو بھی لنچ پر مدعو کیا تو میری صورت دیکھتے ہی بولے:۔
ساری رات شیش محل کی سیر کی ہے نشہ ابھی تک باقی ہے۔ کیسے کیسے" بھر پور مصرعے کہے ہیں جابجا..... ہزاروں سلام پہنچیں اس خاتون مشرق کو جو احسان کے بچوں کی ماں تک ہے۔ احسان کی رفیقہ حیات ہونا تو درکنار..... اور وہ افسر میرٹھی کے لئے کیا لکھا ہے کہ بچپن سے ان کو دیکھ رہے ہیں مگر اب بھی آپ ہمارے برابر ہی نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ فریجریٹر میں بیٹھ کر عمر کو ایک جگہ قائم رکھتے ہیں یا مصری ممی لگانے والا مسالہ "اپنے زندہ جسم پر لگالیتے ہیں۔
اور مجھ کو اس تبصرے سے زیادہ خوشی اس کتاب کی رائلٹی وصول کرتے وقت بھی نہ ہوئی تھی اتنے بڑے مزاح نگار کی یہ سند میرے اترانے کے لئے بہت کافی تھی۔
سونگ پبلسٹی کے محکمہ میں چار پانچ سال تک گانے بجانے کی گزیٹیڈ افسری کر کے میں پھر اپنی اوقات پر آگیا اور پنچولی آرٹ پکچرز سے پھر وابستہ ہوگیا۔اگر ۱۹۴۷ء ہی میں جب قیام پاکستان کے بعد پنچولی صاحب

بمبئی سدھارے اور ریڈیو پاکستان کی داغ بیل پڑی تو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل چھوٹے بخاری یعنی سید ذوالفقار علی بخاری نے مجھ کو پروانہ تقرر دیتے ہوئے کہا کہ "یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ یہاں آپ کیا کریں گے۔ اپنے لئے کام خود پیدا کیجئے۔" چنانچہ میں اپنے لئے کام پیدا کرنے میں اس طرح مصروف ہوگیا کہ اپنے کو بحیثیت قاضی جی کے پیدا کرنا شروع کردیا۔ اے۔ایس۔بی۔ ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کے عہدے سے اپنے آپ کو سبکدوش کراکے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے دہلی سے لاہور آچکے تھے۔ اور اب ان کے بنگلے پر شام کی نشستیں ہوا کرتی تھی۔ جن میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، صوفی تبسم معہ اپنے حقہ کے، جگل کشور مہر اجو مشرف بہ پاکستان ہوچکنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہونے کے ارادے کررہے تھے۔ سید رشید احمد، مولانا چراغ حسن حسرت اور سید امتیاز علی تاج کے اجتماع رہتے تھے۔ جو نہیں آتا تھا اس کو بخاری صاحب خود جا کر پکڑ لاتے تھے۔ جو آجاتے تھے ان کو رات گئے بلکہ کبھی کبھی صبح ہونے سے قبل اپنی کار پر گھر چھوڑنے جاتے تھے اور یہ نصیحت کرتےجاتے تھے کہ رات کو خواہ کہیں رہو مگر صبح اپنے بستر می سے اٹھو۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کو تین بجے آئس کریم کھانے کا دورہ پڑا اور کوشش کی گئی کہ پگھلے ہوئے آئس کریم والوں کو جس طرح بھی ہو اسی وقت جمایا جائے اور حیرت ہے کہ اس وقت بھی ان کو کہیں نہ کہیں آئس کریم مل می گئی اور آئس کریم والے جمع جمائے ڈھونڈ می لئے کہیں نہ کہیں سے۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائریکٹر جگل کشور مہرا پاکستان کے زندہ باد ہونے کے بعد خود عجیب مردہ باد بن کر رہ گئے تھے، کہ بخاری، اردو اور لاہور کے محبت میں رہ تو پڑے پاکستان میں مگر نجانے کیوں ان کو اپنا جگل کشور مہرا ہونا پاکستان میں کچھ پیوند سا نظر آرہا تھا۔ بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے بخاری نے ان کو سمجھایا، دوسرے دوستوں نے بھی اس جلد بازی سے روکا مگر ہوا یہی کہ ایک دن چند مخصوص احباب کی موجودگی میں بخاری صاحب کے گورنمنٹ کالج والے بنگلہ میں وہ مولانا غلام مرشد کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوکر کلمہ شہادت پڑھتے اور مولانا غلام مرشد سے اس کا تفصیلی بلکہ تفصیلی سے بھی کچھ زیادہ ترجمہ سمجھتے نظر آئے اور عین اس وقت جب وہ جگل کشور سے یکایک احمد سلمان بن چکے تھے اسی جگہ ان کی ترقی کے احکام موصول ہوئے کہ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان مقرر کردئے گئے۔ اس کے بعد ہی دوسرا شرعی اجتماع خود احمد سلمان صاحب کی کوٹھی پر اس وقت ہوا جب ان کے نکاح کا مرحلہ درپیش تھا، اور محمود نظامی صاحب کے ذمہ تھا، قاضی کو بلانا جوتھوڑی دیر کے بعد ایک چھوارا نثراد مولانا کو نہ جانے کہاں سے پکڑ لائے۔ بخاری نے ان

مولانا کو بڑے غور سے دیکھا اور میرے کان میں کہا کہ "نکاح کے لئے قاضی اور چھوارے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ نظامی ان دونوں چیزوں کو ملا کر لے آیا ہے۔" اس تقریب میں سید ذوالفقار علی بخاری دولہا کے ولی بنے اور میں دلہن کا ولی۔ ہم دونوں مہر کے تعین پر تھوڑا بہت لڑ جھگڑ کر آخر تصفیہ تک پہنچ ہی گئے۔ بخاری صاحب صرف تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ چھوٹے بخاری وکیل بنے، گواہ میں بنا اور دوسرے گواہ محمود نظامی صاحب۔ اور جب دلہن سے پوچھ کر ہم لوگ قاضی صاحب کے پاس آگئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ ان کو محض یہ سمجھانے میں کتنے لوہے لگے ہیں کہ دلہن کا نام سلمےٰ نہیں بلکہ انور ہے اور دولہا کا نام انور نہیں بلکہ سلمان ہے۔ اس کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ قاضی صاحب نے ان دونوں میں سے کس کو دولہا اور کس کو دلہن سمجھ کر نکاح پڑھایا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ نکاح ان ہی دونوں کا ہوا تھا اور غالباً یہ بات ان ہی دونوں پر چھوڑ دی گئی تھی کہ اپنا دولہا دلہن ہونا خود آپس میں طے کرتے رہیں۔ البتہ جو خطبہ بعد میں پڑھا ہے اس کے متعلق بخاری صاحب کا بیان یہ تھا کہ یہ خطبہ نکاح کا نہیں بلکہ جمعہ کا تھا۔ اس خطبے کے بعد بخاری نے دور سے ایک چھوارا ان مولوی صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا، "مولانا چھوارا۔" اور مولانانے اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے کہا، "جی بسم اللہ" بخاری صاحب نے "جزاک اللہ" کہا اور چھوارا کھاگئے۔ اس کے بعد ہی یہ شیرازہ منتشر ہوگیا۔ ریڈیو پاکستان کا میڈکوارٹر کراچی چلاگیا۔ چھوٹے بخاری صاحب معہ رشید احمد صاحب اور احمد سلمان صاحب کے کراچی چلے گئے۔ بڑے بخاری صاحب یواین او میں جاپہنچے، میں لاہور ہی میں رہ گیا۔ اس سناٹے میں اپنے کو الجھانے کے لئے کئی سال بعد کراچی میں اپوا کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ بخاری صاحب ان دنوں امریکہ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے اس مشاعرے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیا۔ کہ کراچی میں بخاری صاحب سے ملاقاتیں رہیں گے۔ سلمان صاحب بھی وہیں ہیں، رشید صاحب اور چھوٹے بخاری صاحب بھی وہیں۔ ایک مرتبہ پھر کھلی صحبتیں گرم ہوجائیں گے اور کراچی پہنچ کر جب یہ معلوم ہوا کہ اس مشاعرے کی صدارت بھی بخاری صاحب ہی کررہے ہیں تو اور بھی خوشی ہوئی۔ مشاعرے میں پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ چنانچہ جب میں پہنچا ہوں تو بخاری صاحب فی البدیہہ صدارتی خطبہ ارشاد فرمارہے تھے اور ذکر کچھ میرا ہی تھا کہ، "اس مشاعرے میں شرکت کے لئے شوکت تھانوی بھی آئے ہوئے ہیں جن سے میں یہ پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں کہ آخر وہ کسی تھانے یا کس تھان سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ ان کا کوئی ایسا گہرا راز ہے وہ کسی طرح اسے کھولنا گوارا نہیں کرتے".... اس مشاعرے کے بعد دوسرے یاتیسرے دن بخاری صاحب نے اپنے گھر پر اپنے چند نیاز مندوں

کو لنچ دیا۔ اس میں شرکت کے لئے جب میں پہنچا تو بخاری صاحب محض ایک نکر پہنے باقی مہاتماگاندھی بنے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر دل کو ایک دھچکا سا پہنچا، ہڈیوں کا ایک نحیف ونزار ڈھانچہ تھا۔ ان کے قلب کے دورے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی، آج ان کا یہ لاغر جسم دیکھ کر بے ساختہ دل سے ان کی صحت اور درازی عمر کی دعائیں نکلنے لگیں مگر بخاری صاحب نے اپنے لطائف وظرافت سے بہت جلد اس اضمحلال کو ختم کردیا۔ البتہ کھانے کی میز پر جب کھانا کھاچکنے کے بعد میں نے ایک ڈش سے جیلی اپنی پلیٹ میں نکالی ہے تو بخاری صاحب دوڑ پڑے، "یہ نہ لینا بھوکا مرجاؤں گا میں۔" معلوم ہوا کہ وہ صرف ناشپاتی کے ابلے ہوئے چند ٹکڑے اور یہ جیلی ہی کھاسکتےہیں۔ یہی ان کی غذا ہے اور یہی غذائیت سے بے نیاز غذا کھاکھا کر وہ جی رہے ہیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کتنا ترس آیا ہے ان پر۔ کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ ان سے کہوں کہ اب آپ امریکہ نہ جائیں مگر میں ان پر وہ خطرہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا جو خود محسوس کررہا تھا۔ آخر پچھلے سال جب میں ریڈیو پاکستان سے سبکدوش ہو کر پھرصحافت میں آگیا تھا اور روزنامہ جنگ کی ادارت کے سلسلہ میں مستقلاً کراچی کا ہوگیا اور آخری مرتبہ بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ہمت کر کے ان سے کہہ ہی دیا کہ اب آپ کراچی سے نہ جائیں اور اس کا جواب بھی سن لیا کہ "اگر آپ پکے کاغذ پر یہ لکھ دیں کہ میں کراچی میں رہ کر نہ مروں گا تو میں امریکہ جانے کا ارادہ ملتوی کرنے کو تیارہوں۔" چنانچہ وہ پھر امریکہ گئے اور اب کبھی امریکہ سے واپس نہ آئیں گے۔ اب کراچی میں کوئی ان کا انتظار نہ کرے گا۔ اب کوئی ان سے اصرار نہ کرے گا کہ امریکہ نہ جائیے۔

* * *